Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1982

اس پرچہ میں

ملوکیت اور اسلام

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۵	جولائی ۱۹۸۲ء	شمارہ ۷

فہرست

۱- لمعات ---------- ۲

۲- حقائق و عبر --- (۱) مسئلہ قومیّت اور ملوکیّت ---- ۵

(۲) وفاقی شرعی عدالت میں پیش ہونے والے حضرات ——

(۳) ایران و عراق جنگ —— (۴) اسرائیل کی سفّاکیاں ——

(۵) یا مشرک بنو یا نقصان اٹھاؤ! — (۶) تصویر کی شرعی حیثیت ——

(۷) قرآنِ خالص —— (۸) مرنے کے بعد سند! ——

۳- نوادرات --- (محترم پرویز صاحب) ------- ۱۹

۴- کیا جنسی تعلق ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے؟ -------- ۳۴

—— (محترم پرویز صاحب) ——

۵- درسِ قرآنی کے اعلانات ---------- ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر شیخ عبدالحمید مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور مطبوعہ - اشرف پرنٹنگ پریس - ۹ رایبک روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۹۱۱-۱۲ء میں جنگِ بلقان کے سلسلہ میں مسلمانوں کے بعض ممالک پر بڑی تباہی آئی تھی۔ (بالخصوص) طرابلس میں بے محابا خونریزی کی خبروں نے مسلمانانِ ہند کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی تھی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد ہوئے تھے۔ لاہور میں یہ اجتماع شاہی مسجد میں منعقد ہوا تھا جس میں علامہ اقبال نے وہ دردانگیز اور قیامت خیز نظم پڑھی تھی جو بانگِ درا میں "حضور رسالتمآب میں" کے عنوان سے محفوظ ہے۔ وہ نظم انہوں نے عجیب محاکاتی انداز سے لکھی تھی جس کا ابتدائیہ یوں تھا کہ

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو!

بارگاہِ رسالتمآب میں حاضر ہوئے تو حضور نے پوچھا کہ

ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

جواب میں عرض کیا کہ

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی!
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

اس آبگینہ میں جو چیز ہے ——— جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں!

جو لوگ اس اجتماع میں موجود تھے ان کا بیان تھا کہ جب اقبال نے اگلا (اور آخری) مصرعہ پڑھا تو صحنِ مسجد محشرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ در و دیوار سے ٹکریں مار رہے تھے۔ اقبال خود بھی بے حال ہو رہا تھا۔ درد و کرب سے معمور فضا۔ سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی اقبال کی آواز۔ اور بحضور رسالتمآب یہ عرضداشت کہ

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہم اُس زمانے میں انگریز کے غلام تھے۔ احتجاجی چیخ و پکار سے زیادہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

———(۰)———

پہلی جنگِ عظیم کے بعد، مغرب کی استعمار پسند قوتوں نے ترکی کے حصے بخرے کر دیئے تو مسلمانوں کے جگہ

چاک چاک ہو گئے۔ ملک کے گوشے گوشے میں احتجاجی اجتماعات منعقد ہوئے۔ اسی سلسلہ میں انجمن حمایتِ اسلام (لاہور) کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ میں علامہ اقبالؒ نے مصرایک آہ و فغاں سے لبریز نظم پڑھی جس نے ملک کے در و دیوار کو ہلا دیا۔ یہ نظم بانگِ درا میں، خضرِ راہ کے عنوان سے مطبوع ہے۔ اس میں انہوں نے اسی سوز و گداز سے کہا کہ

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ دیوارِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اور پھر یہ درد انگیز نالہ و فغاں کہ

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اور ان تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہنے کا طریق یہ بتایا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

یہ تو نسلی امتیاز کی بنا پر تفرقہ کے خلاف تھا۔ مذہبی فرقہ بندی کے متعلق ایک ہی شعر میں یہ حقیقت واشگاف کر دی کہ قرآن کی رو سے تفرقہ شرک ہے۔ کہا:-

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش — اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اس زمانے میں بھی ہم انگریز کے غلام تھے لیکن اس کے باوجود یہاں احیائے خلافت کی تحریک کی بنا رکھی گئی۔۔۔۔ یہاں اس تحریک کے حسن و قبح سے بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے کسی ویرانے میں بھی کسی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تھا تو ہندی مسلمان کی آنکھ کے آبگینے سے آنسو ڈھلک پڑتا تھا۔

(۲)

حال ہی میں اخبارات میں یہ خونچکاں خبر شائع ہوئی کہ

> اسرائیل کے لبنان پر حملہ کے گیارہ روز کے اندر، فلسطینیوں کے تیس ہزار افراد قتل ہو چکے ہیں۔ اسی ہزار کے قریب زخمی ہوئے ہیں اور ایک لاکھ کے قریب خانماں خراب۔ یہ تفصیل پی۔ ایل۔ او کے ترجمان نے، یو۔ این۔ او کو بھیجی ہے۔
> (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۸ جون ۱۹۸۲ء)

اور اس کے دو دن بعد اس قسم کی خبریں کہ

> جنوبی لبنان کے شہر صیدون پر اسرائیلی فوجوں کے قبضہ کے دوران ہلاک ہونے والے سینکڑوں شہریوں کی لاشوں کو شناخت اور گنتی کے بغیر ہی اجتماعی قبروں میں دفن کیا جا رہا ہے۔

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے یہ انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سینکڑوں عورتیں اور بچے ایک ثانوی سکول پر اسرائیلی بم گرنے سے ہلاک ہو گئے تھے۔ قناعیہ کے علاقہ میں واقعہ اس سکول کے تہہ خانے میں ابھی تک لاشیں پڑی ہیں — ان سینکڑوں عورتوں اور بچوں نے حملوں سے بچنے کے لئے وہاں پناہ لی تھی۔ لاشوں پر مٹی پڑ رہی ہے اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔

(جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۲ جون ۱۹۸۲ء)

یہ خبریں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء کی خبروں سے کچھ کم خونچکاں اور جگر فگار نہیں لیکن اب ملک میں نہ کوئی کہرام مچا ہے، نہ قیامت برپا ہوئی ہے۔ یہ خبریں اس طرح پڑھی گئی ہیں گویا ان کا تعلق ٹمبکٹو کے کسی ویرانے سے ہو۔ اب یہاں کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

اب، اقبالؒ ہی کے الفاظ میں — مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے — حالانکہ اس زمانے میں ہم انگریز کے غلام تھے، اور اب (بفضلہٖ تعالیٰ) آزاد اور خود مختار ہیں۔

یہ فرق کیوں ہے؟ بات واضح ہے۔ اس زمانے میں ہمارا سیاسی شعور ہنوز بیدار نہیں تھا اور ہم محض بربنائے عقیدت یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں بسنے والے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اور ہم سب ایک اُمّت کے افراد ہیں۔ اب سیاسی شعور کی بیداری (یا حقیقت سے آگہی) سے یہ راز منکشف ہوا کہ موجودہ مسلمانوں کا ایک امّت کے افراد اور آپس میں بھائی بھائی ہونے کا تصور خود فریبی ہے۔ چھوٹے پیمانے پر یہ مختلف فرقوں (اور پارٹیوں) میں بٹے ہوئے گروہ ہیں، اور وسیع پیمانے پر (غیر مسلموں کی طرح) مختلف قومیں۔ اسلام کا محض لفظ زبانوں پر ہے معنی اس کے کچھ نہیں۔ نہ یہ مسلمانوں میں وجہ اشتراک ہے نہ بنیادِ رابطہ۔ یوں دیکھئے تو اسلامی کانفرنس۔ اسلامی سمینار۔ رابطہ عالم اسلامی۔ مؤتمر عالم اسلامی نام کی بیسیوں تنظیمات موجود ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ مختلف ممالک میں بسنے والے اور مختلف نسلوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں میں قلبی رابطہ پیدا کرنے کا مقصد پورا کر رہی ہے، نہ ان میں ایک اُمّت ہونے کا جذبہ بیدار۔ دور کیوں جایئے۔ خود اپنے ملک میں دیکھئے۔ ہر روز اخباروں کے صفحۂ اوّل پر حادثات میں ہلاک ہو جانے والوں کی بھی خبریں شائع ہوتی ہیں، اور انفرادی قتل کی وارداتوں کی بھی۔ ان میں سے بعض بڑی ہی درد انگیز ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے بجز ان کے جو ہلاک یا زخمی ہونے والوں کے رشتہ دار ہوں، کوئی متاثر نہیں ہوتا یعنی محض مسلمان ہونا ان میں کوئی اشتراک پیدا نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں جب تک مسلمانانِ عالم اس غلط فہمی سے نہیں نکلتے کہ اسلام ان میں وجہ اشتراک ہے، ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام ہم میں موجود ہی نہیں تو وہ وجہ اشتراک کس طرح ہو سکتا ہے؟ جس طرح عیسائیوں کی مختلف قومیں ہیں، اسی طرح مسلمانوں کی بھی مختلف قومیں ہیں۔ انہیں اپنے معاملات قوموں کی طرح حل کرنے چاہئیں۔ اسلام ان میں وجہ اشتراک اس وقت ہو گا جب ان کی ایک اُمّت۔ ایک ضابطۂ قوانین (قرآن) اور ایک مرکزی اتھارٹی ہو گی۔

(۱)

حقائق و عبر

ا۔ مسلم قومیت اور ملوکیت

علامہ اقبالؒ کے فرزندِ ارجمند، ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال 'زندہ رود' کے نام سے، حضرت علامہؒ کے سوانح حیات مرتب فرما رہے ہیں۔ اس کی دوسری جلد پر، (اقبال اکادمی کے) مجلّہ اقبال ریویو کی جنوری ۸۲ء کی اشاعت میں، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ (بھارت) کے سید صباح الدّین عبدالرحمٰن صاحب کے قلم سے طویل تبصرہ شائع ہوا ہے۔ ہمیں کتاب، 'زندہ رود' کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس تبصرہ میں دو ایک مقامات ایسے ہیں جو علامہ اقبالؒ کی بنیادی فکر کے بھی خلاف ہیں، اور اسلام کے اساسی اصولوں کے بھی منافی۔ ان کی نشاندہی ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے قرآنِ کریم کی جن بنیادی حقیقتوں کو پیش کیا تھا، ان میں دو ایک کو بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یعنی یہ کہ (۱) اسلام میں معیارِ قومیت ایمان کا اشتراک ہے، نہ کہ وطن کا اشتراک۔ اور (۲) اسلام مذہب نہیں دین ہے، جو مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ہی زندہ حقیقت بن سکتا ہے۔ یہی دونوں حقیقتیں مطالبہ (اور تحریکِ) پاکستان کی بنیاد تھیں۔ اور انہی کی مخالفت، نیشنلسٹ مسلمانوں (بالعموم نیشنلسٹ علماء) کی طرف سے ہوئی تھی۔ اربابِ دارالمصنّفین کا تعلق انہیں سے تھا۔ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کے مطابق، پاکستان کا خطۂ زمین تو حاصل ہو گیا لیکن اس سے نیشنلسٹ علماء کو جو شکست ہوئی اس کی کسک ان کے دل سے گئی ہی نہیں، اور وہ ... موقعہ بے موقعہ، اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں۔ اس تبصرہ میں اس کا کوئی موقع و محل نہیں تھا لیکن اس کے باوجود، سید صباح الدّین صاحب نے یہ لکھ ہی دیا کہ

> مسلم قومیّت کی جو ترویج ڈاکٹر صاحب (یعنی ڈاکٹر اقبالؒ) نے کی تھی، ان کے زمانے میں ضرور اُبھری اور پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام پر ختم ہو گئی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہ مسلم قومیت مشرقی بنگال میں بوڑھی گنگا اور برہم پترمیں جا کر غرقاب ہوئی اور سندھ میں غولِ بیابانی بن کر منڈلا رہی ہے اور بلوچستان کی پہاڑیوں سے بھی ٹکرا رہی ہے اور سرحد کی سرزمین میں خاک آلود ہو رہی ہے۔ (معارف۔ صفحہ ۱۱)

سب سے پہلے تو اس ذہنی انتشار پر غور کیجئے جو اس اقتباس سے ہویدا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی مسلم قومیّت پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام پر ختم ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ جو چیز قیامِ پاکستان

پر ختم ہو گئی تھی، اس کے قیامِ پاکستان کے بعد گنگا میں ڈوب جانے یا بلوچستان اور سرحد کے میدانوں میں خاک آلود ہونے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ختم شدہ چیز بھی کبھی ڈوبا اور خاک آلود ہوا کرتی ہے؟ آپ نے دیکھا کہ آتشِ انتقام ان حضرات کے ذہنوں کو کس طرح ماؤف کر رہی ہے؟

دوسری بات یہ کہ مسلم قومیت کا جو تصور علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، وہ اسلام کے مطابق تھا، یا مخالف؟ اگر وہ اسلام کے مطابق تھا تو بنگال، سندھ، بلوچستان تو ایک طرف، ساری دنیا کے مسلمان بھی اسے مسترد کر دیں تو وہ پھر بھی مبنی بر صداقت رہے گا ——— اور اگر وہ اسلام کے منافی تھا تو ساری دنیا کے مسلمان بھی اسے قبول کر لیں تو بھی وہ باطل کا باطل رہے گا۔ یہ کونسی دلیل ہے کہ اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان کسی اسلامی حقیقت کو مسترد کر دیں تو وہ باطل قرار پا جائے! باطل پرست وہ مسلمان قرار پائیں گے نہ یہ کہ وہ صداقت باطل بن جائے گی۔ سید صاحب کی دلیل بڑی عامیانہ ہے (یہ حضرات تحریکِ پاکستان کے دوران بھی اسی قسم کے دلائل پیش کیا کرتے تھے)۔ اگر اس دلیل کو وقیع تسلیم کر لیا جائے تو پھر خود اسلام کی صداقت کے دعویٰ سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا۔ دنیا کا کونسا ملک ہے جس نے اسلام کو عملاً مسترد نہیں کر رکھا!

——— (٠) ———

ملوکیّت

اس کے بعد اس تبصرہ میں ایسی بات کہی گئی ہے جس سے اسلام کی روح کپکپا اٹھتی ہے، لکھا ہے:۔

> ڈاکٹر صاحبؒ کے حوالے سے مصنّف نے یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآنِ مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے (ص ۹)، مگر (ص ۱۹۲) پر ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے لئے کسی حتمی کانسٹی ٹیوشن یا حکومت کی کسی قسم کی تفصیل موجود نہیں ہے' کیونکہ ایسے ادارے ملّت اپنے ضمیر کی روشنی میں قائم کر سکتی تھی، اور بہر صورت وہ دائمی قرار نہ دئیے جا سکتے تھے، کیونکہ ملّت کی بدلتی ہوئی سیاسی ضروریات کے تحت وہ قانون کے تغیّر کے پابند تھے (ص ۱۹۲) جب قرآنِ مجید اور احادیث میں کوئی حتمی کانسٹی ٹیوشن نہیں، تو یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ قرآنِ مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے، اور اگر انتخاب اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے تو اس انتخاب کے طریق کی کہیں وضاحت نہیں۔ خود خلافتِ راشدہ میں اس کا کوئی خاص طرز مقرر نہیں رہا۔ جب جیسی ضرورت ہوئی اسی لحاظ سے انتخاب کا اصول طے کر لیا گیا، اور اگر ملّت کو یہ حق رہا کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں زمانے کے اقتضاء کے مطابق حکومت قائم کریں تو خلافتِ راشدہ کے بعد جو موروثی ملوکیت قائم ہوتی رہی تو کیا وہ ملّت کے ضمیر کی روشنی اور زمانے کے تقاضے کے خلاف تھی؟ تو اس کے خلاف بغاوت کیوں نہیں ہوتی رہی اور کیوں تیرہ سو ستّر سال تک قائم ہوتی چلی آئی، اور آج بھی خود حجاز کے اندر موروثی ملوکیت قائم ہے؟ اگر

ملّت کا ضمیر اس کو گوارا کر جائے تو خیر۔ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام میں موروثی بادشاہت کے تصوّر کی کوئی گنجائش نہیں۔ (ص ۱۹۲)

تبصرہ کے اندازِ بیان میں اُلجھاؤ کی وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کونسے الفاظ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے ہیں اور کونسے تبصرہ نگار کے۔ اس کے بعد البتہ ایک پیرا تبصرہ نگار کی طرف سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسے بھی سامنے پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ تحریر ہے:۔

> اس باب میں خلافت اور سلطنت پر لائق مصنّف نے بڑی اچھی بحث کی ہے، جو آج کل کے سیاسی تقاضے کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ کلامِ پاک میں ملک (بادشاہ) کا ذکر تو آتا ہے لیکن جمہوریت کا کہیں ذکر نہیں۔ (انٹروڈکشن ٹو اسلام۔ از ڈاکٹر حمید اللہ، ۱۹۷۷ء ایڈیشن، ص ۱۰۹) اور، جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، قرآنِ مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے کسی حتمی دستور یا حکومت کی نوعیت کی تفصیل موجود نہیں تو جمہوریت اسلامی ملک کے سیاسی نظام کے لئے ضروری نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کے سیاسی نظام کے ذریعے قانونِ شریعت کا نفاذ ہوتا رہے۔ اسی اور صرف اسی سے ملّت کے ضمیر کی روشنی کی عکاسی ہو سکتی ہے، خواہ اس کا نفاذ رائے بالغان کے ذریعے، پارلیمانی یا صدارتی نظام حکومت سے ہو، یا ڈکٹیٹرشپ ہی کے ذریعہ سے کیوں نہ ہو۔ اگر ایک بادشاہ یا ڈکٹیٹر شرعی قوانین کا پابند ہو، یا کم از کم ان کے نفاذ کے لئے کوشاں ہو تو کیا وہ اس لئے پسند نہیں کیا جائے گا کہ وہ رائے بالغان کے ذریعے سے منتخب نہیں ہوا ہے۔

اس میں اسلام کی اصل و حقیقت کو اس قدر مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی تردید اور تطہیر کے لئے ایک مبسوط مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی سردست ضرورت نہیں۔ ویسے بھی، طلوعِ اسلام میں ان موضوعات پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مملکت یا حکومت کے ضمن میں حسبِ ذیل بنیادی حقائق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کی رُو سے، مملکت کوئی جائداد نہیں کہ جس کا جی چاہے اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے۔ قوانینِ خداوندی کا نافذ کرنا پوری کی پوری اُمّت کا فریضہ ہے اور مملکت اس تنظیم کا نام ہے جس کی رُو سے اُمّت اپنے اس فریضہ کو ادا کرتی ہے۔ قرآن نے اِستخلاف فی الارض (۲۴/۵۵) اور تمکّن فی الارض (۲۲/۴۱) کی حامل ساری اُمّت کو بتایا ہے۔ اور اُمّت باہمی مشاورت سے اس تنظیم کو قائم کرتی ہے جس کی وساطت سے قوانینِ خداوندی نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی فرد یا افراد کا مجموعہ زبردستی حکومت پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ اسلامی نظام کو جڑ بنیاد سے کاٹ دیتا ہے۔ اور جب وہ موروثی ہو جائے تو وہ ذاتی جائداد بن جاتی ہے۔ اسلام اس تصوّرِ حاکمیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے سوانح نگار کو (کم از کم) علامہ اقبالؒ کے اس قسم کے ارشادات ہی پیشِ نظر رکھنے چاہئیں تھے ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است

غلام فقر آں گیتی پناہ ہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است (ارمغانِ حجاز ص۱۲)

جسے علامہ اقبالؒ دینِ مصطفوی میں حرام قرار دے رہے ہیں، اسے یہ حضرات عین مطابق اسلام ٹھہراتے ہیں! (یاللعجب)۔

(۲) قرآنِ کریم چونکہ عالمگیر ضابطۂ ہدایت ہے اور قیامت تک کارفرما رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس لئے اس کا انداز یہ ہے کہ اس میں اصول و اقدار دیئے گئے ہیں، ان پر عمل پیرا ہونے کے طرق اور اسالیب نہیں دیئے گئے۔ یہ اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے انداز اور طریق (ہر زمانے کی) اُمت خود وضع کرے گی۔ یہ طرق و انداز بہ تقاضائے وقت قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔ بالفاظِ دیگر، قرآنی اصول و اقدار وہ حدود اللہ ہوں گی جن کے اندر رہتے ہوئے، اُمت ان کے نفاذ کے طریق باہمی مشاورت سے وضع کرے گی۔ ان طریقوں کے وضع کرنے کا اُمت کو اختیار ہوگا لیکن اس میں بھی شرط یہ ہوگی کہ کوئی طریق، قرآنی اصول و اقدار سے ٹکرائے نہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن میں کانسٹی ٹیوشن کی جزئیات یا قوانین کی فروعات نہیں دی گئیں۔ صرف اصول و اقدار دی گئی ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم نے، ملکی تنظیم قائم کرنے کے لئے اُمت کے باہمی مشورہ کو غیر متبدل اور ابدی قرار قرار دیا ہے۔ اس نے اس کا طریق کار یا طرز خود متعین نہیں کیا۔ اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ اس میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ لیکن اسے اس کا قطعاً اختیار نہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کر لے جس میں مشاورت نہ ہو۔ بنابریں ڈکٹیٹر شپ، ملوکیت، یا موروثی حکومت کسی صورت میں بھی مطابقِ اسلام قرار نہیں پا سکتی۔ اسی طرح ایسی مشاورت بھی مطابقِ اسلام قرار نہیں پا سکتی (مثلاً مغربی جمہوریت) جو اپنے فیصلوں میں حدود اللہ کی پابند نہ ہو۔

(۴) سید صباح الدین صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر ایک بادشاہ یا ڈکٹیٹر شرعی قوانین کا پابند ہو۔ یا کم از کم ان کے نفاذ کے لئے کوشاں ہو تو کیا وہ اس لئے پسند نہیں کیا جائے گا کہ وہ رائے بالغان کے ذریعے منتخب نہیں ہوا؟" سید صاحب کی خدمت میں گذارش ہے کہ سوال رائے بالغان یا نابالغان کا نہیں۔ اگر وہ اسلامی طریق سے منتخب نہیں کیا گیا، تو اسے کسی صورت میں پسند نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ کتنا ہی "شرعی قوانین کا پابند ہو"۔ ظاہر ہے کہ "شرعی قوانین" سے ان کی مراد نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ یا نکاح۔ طلاق جیسے احکام ہی ہو سکتے ہیں۔ (یہی اسلام یہ حضرات تحریکِ پاکستان کے دوران پیش کیا کرتے تھے) جو شخص خلافِ شریعت طریق سے حاصل کردہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہے، اس کی نماز روزے کی پابندی اسے جائز حاکم نہیں بنا سکتی۔ اور جس کا خود وجود ہی خلافِ شریعت ہو، وہ قوانینِ شریعت کیا نافذ کرے گا؟

تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں یہ حضرات اسی قسم کے دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں ہندوؤں کی اکثریت کے زیرِ حکومت زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ لیکن جب ہمیں اپنے احکامِ شریعت پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی، تو پھر ان کے زیرِ اقتدار رہنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہی دلیل

(یہ تبدیلیٔ الفاظ) سید صاحب اب پیش فرمارہے ہیں۔

سید صاحب تو شاید اسے (APRECIATE) نہ کرسکیں، لیکن جسٹس جاوید اقبال ؒ ہم سے متفق ہوں گے، کہ اگر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے کسی جج کا تقرر، کانسٹی ٹیوشن کے خلاف ہو، تو اس کا کوئی فیصلہ (خواہ وہ کتنا ہی ضابطہ و قوانین کے مطابق کیوں نہ ہو) قانونی میزان میں قابلِ تسلیم قرار نہیں پائے گا۔ اس کے فیصلوں کے قانونی تسلیم کئے جانے کی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ خود اس کا تقرر قانون کے مطابق ہو۔ جس حکمران کا حاملِ اقتدار ہونا ہی خلافِ اسلام ہو، اس کے نافذ کردہ قوانین کس طرح اسلامی تصوّر کئے جاسکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک' اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت اور کیفیت' ٹریفک کے سپاہی کی سی ہے جو چوراہے پر کھڑا ٹریفک کو روکتا اور چلاتا ہے۔ کار والوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس سپاہی نے رشوت دے کر وہ ملازمت حاصل کی ہے۔ سفارش سے کی ہے۔ یا جعلی سارٹیفکیٹ پیش کرکے نہ ہی اس سپاہی کو اس سے غرض ہوتی ہے کہ وہ راہ گیر کے متعلق یہ معلوم کرے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جارہا ہے۔ اسے صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس نے ٹریفک کے اشارے کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ سیکولر نظام میں، اربابِ اقتدار، قانون اور افرادِ معاشرہ کا باہمی تعلق کچھ ایسا ہی (میکانیکل سا) ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ اس میں ہر قانون کی متابعت کا اثر فردِ متعلقہ کی سیرت پر بھی پڑتا ہے اور قانون نافذ کرنے والوں کی سیرت، اس باب میں قانون سے بھی زیادہ مؤثر ہوتی ہے جس جج کے متعلق یقین ہو کہ وہ نہایت دیانتداری سے، انصاف کے مطابق فیصلے صادر کرتا ہے، اس کے فیصلے کے خلاف اُس کے دل میں بھی کبیدگی پیدا نہیں ہوتی جس کے خلاف فیصلہ صادر ہو۔ اسلامی مملکت کے اوّلین سربراہ (حضورؐ نبی اکرم) کے فیصلوں کی یہی خصوصیت تھی جس کا نتیجہ یہ تھا: لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ ...... (۴/۶۵) " جن کے خلاف فیصلہ صادر ہوتا تھا وہ بھی اپنے دل میں اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں کرتے تھے"۔ اس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ سربراہِ مملکت خود اسلامی اقدار کے مطابق برسرِ اقتدار آیا ہو۔ جس سربراہ کے متعلق لوگ جانتے ہوں کہ وہ ڈاکو ہے، اس کے صحیح فیصلے بھی صحیح نتائج پیدا نہیں کرسکتے۔ افرادِ معاشرہ اس کے اقتدار کو بھی ظلم و جور محسوس کرتے ہیں۔ اس کے قوانین کو بھی ظلم و جور، اور ان کی اطاعت کو بھی جبر و جور کا نتیجہ۔ یہ وجہ ہے کہ ڈکٹیٹرشپ۔ ملوکیت (اور اس کی بدترین شکل موروثی ملوکیت) اور اسلامی مملکت ایک دوسرے کی ضد ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہوسکتیں۔ اسلام آیا ہی اس قسم کے اندازِ حکومت کو مٹانے کے لئے تھا۔ اس نظام میں

عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ملوکیت کو؟

(۵) اس کے بعد جسٹس جاوید اقبال (اور انہیں کے تتبع میں، سید صباح الدین صاحب) نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر اسے ہم خود اپنی آنکھوں سے پڑھ نہ لیتے اور کوئی دوسرا شخص ہم سے وہ بات روایتہً

کہتا، تو ہم اسے جسٹس موصوف کی طرف منسوب کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> اگر ملت کو یہ حق رہا کہ وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں زمانے کے اقتضا کے مطابق حکومت قائم کریں تو خلافتِ راشدہ کے بعد جو موروثی ملوکیت قائم ہوتی رہی تو کیا وہ ملت کے ضمیر کی روشنی میں اور زمانے کے تقاضے کے خلاف تھی۔۔۔۔ اگر ملت کا ضمیر اس کو گوارا کرتا رہا تو پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام میں موروثی ملوکیت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ (صفحہ ۱۱)

سب سے پہلے تو اس غلط فہمی اور مغالطہ آفرینی کو رفع کر لیجئے کہ قرآن نے ملت کو یہ حق کہیں نہیں دیا کہ "وہ اپنے ضمیر کی روشنی میں زمانے کے اقتضا کے مطابق" جس قسم کی جی چاہے حکومت قائم کرلے۔ اس نے ملت کو اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی ابدی، "ناقابلِ تغیر" حدود کے اندر رہتے ہوئے "اپنی صوابدید اور زمانے کے تقاضے کے مطابق حکومت کی شکل متعین کرلے۔ اگر کوئی حکومت قرآنی حدود سے ٹکراتی ہے تو وہ ہزار "ملت کی ضمیر اور زمانے کے تقاضوں" کے مطابق ہو، غیر اسلامی ہے اور اس قابل کہ اسے یکسر مسترد کر دیا جائے۔ اُمت کی مشاورت، ابدی اور غیر متبدل اصول ہے، اس لئے ملوکیت (خواہ موروثی ہو اور خواہ غیر موروثی ـــــ یعنی قوت کے بل بوتے پر حاصل کردہ حکومت) یکسر غیر اسلامی۔ نہ ملت کو اُسے قائم کرنے کا حق حاصل تھا اور نہ ہی وہ اس لئے جائز قرار پا سکتی ہے کہ ملت نے اُسے قائم کیا تھا۔ اگر کل کو ملت بت پرستی پر اُتر آئے (اور عملاً تو اس نے آج بھی اختیار کر رکھی ہے اگرچہ وہ بُت مٹی اور پتھر کے نہیں، انسانی پیکروں کے ہیں) تو کیا اُسے بھی اسلامی تسلیم کر لیا جائے گا؟

محترم جسٹس، ملت کے ضمیر پر بڑا زور دیتے ہیں۔ ہم جنابِ محترم سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ "ضمیر" بالآخر ہے کیا بلا؟ عصرِ حاضر کی علمی تحقیق تو اس کے الگ وجود ہی کی قائل نہیں، وہ اسے...... (INTERNALISED SOCIETY) قرار دیتی ہے۔ یعنی جو کچھ معاشرہ میں ہو رہا ہے اس کا غیر شعوری اثر افراد کے دل و دماغ کے ساتھ پیوست ہو جاتا۔ لہٰذا جس قسم کا معاشرہ، اسی قسم کا ضمیر۔ یعنی جس قسم کے ماحول میں کسی نے پرورش پائی ہو اسی قسم کا اس کا ضمیر ہوتا ہے۔ ایک جینی بچے کا "ضمیر" گوشت کے تصور تک سے اِبا کرتا ہے۔ مسلمان بچہ لپک کر بوٹی پکڑ لیتا ہے۔

قرآن کریم میں ضمیر کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس میں ایک لفظ ھویٰ آیا ہے جس کے معنی انسانی خیالات یا خواہشات کے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وحی کے کنٹرول سے بے باک ہو کر، ھویٰ کا اتباع کرنے والے بدترین گمراہی میں ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک کسی بات کے جائز یا ناجائز۔ یا اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کے لئے سند وحیٔ خداوندی ہے (جس میں ہویٰ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ۵۳/۴) نہ کہ انسانوں کے خیالات یا خواہشات (خواہ ان کا نام ضمیر رکھ لیجئے)۔ قرآن کریم نے تو "اجتماعی ضمیر" تک کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ...... (۶/۱۱۶) "اے رسول! اگر تو اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت اختیار کرلے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گے"۔

یہ ہے "معاشرہ کی ضمیر" کو سند قرار دینے کا نتیجہ!

لیکن دُور کیوں جائیے! آج ہمارے معاشرہ کی (شاید 90% سے بھی زیادہ) اکثریت ہر ناجائز طریق سے حاصل کردہ دولت کو جائز سمجھتی ہے۔ اور ان کا "ضمیر" اس پر مطمئن ہے۔ کیا آپ ان کے ضمیر کی آواز کو، حرام کی کمائی کو حلال سمجھنے کے لئے سند قرار دیں گے؟ اگر یہی سند ہے تو پھر آپ، ناجائز کمائی کو جرم کیوں قرار دیتے ہیں، اور...... آپ کے اس لمبے چوڑے نظامِ عدل و مؤاخذہ کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سارا انتظام قانون کو سند تسلیم کرتا ہے، معاشرہ کے ضمیر کو نہیں۔ خود جسٹس جاوید اقبال، جج کی حیثیت سے اسی اصول کو معیارِ عدل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کے معاملہ میں ان کا معیار مختلف ہے!

(۶) اس کے بعد جسٹس جاوید اقبال فرماتے ہیں:۔

...... خلافتِ راشدہ کے بعد جو موروثی ملوکیت قائم ہوتی رہی تو کیا وہ ملت کے ضمیر کی روشنی اور زمانے کے تقاضے کے خلاف تھی؟ تو اس کے خلاف بغاوت کیوں نہیں ..... اور آج بھی خود حجاز کے اندر موروثی ملوکیت قائم ہے۔ اگر ملت کا ضمیر اس کو گوارا کرتا رہا ہے تو پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام میں موروثی ملوکیت کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ (ص۱۱۱)

سبحان اللہ! کیا محکم دلیل ہے! چونکہ بنی اسرائیل نے ملوکیتِ فرعونیہ کے خلاف کبھی سرکشی نہیں کی تھی، اس لئے وہ یکسر جائز اور مبنی برحق تھی۔ خدا کو (معاذ اللہ) کیا حق حاصل تھا کہ اسے ناجائز قرار دے کر اس کے خلاف انقلابی تحریک برپا کرتا!

جس اقبالؒ کی جسٹس جاوید سوانح عمری مرتب فرما رہے ہیں، ملوکیت کے ہلاکت آمیز اثرات کے خلاف انہوں نے جس قدر، جس جس انداز سے لکھا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ دو ایک مقامات ملاحظہ فرمائیے۔ جاوید نامہ میں ہے:۔

از ملوکیت نگہ گردد دِگر! — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دِگر (ص۸۷)

ارمغانِ حجاز میں ہے ——— ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ ..... (ص۱۲۶)۔ وہ جابر حاکم کے مشیران و وزیران کے متعلق کہتے ہیں:۔

خداوندے کہ در طوفِ حریمش — صد ابلیس است و یک روح الامین نیست (ص۲۰۳)

ملوکیت جو حربے استعمال کرتی ہے، ان کے متعلق کہتے ہیں:۔

شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری (ص۲۶۲)

وہ اس جادو کی تشریح بانگِ درا میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ان الملوک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری! (ص۲۹۵)

قرآنِ کریم نے ان حربوں کو دو ایک مقام پر نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے کہ فرعون کرتا

یہ تھا کہ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ...... (۲/۴۹)۔ وہ قوم بنی اسرائیل میں، جن لوگوں کو دیکھتا کہ ان میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہو رہی ہے، انہیں پامال کر دیتا اور آگے انہیں بڑھاتا جو ان جوہروں سے عاری ہوتے۔ پھر اس کی ٹیکنیک یہ تھی کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ...... (۲۸/۴)۔ وہ قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا۔ کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا، کبھی دوسری کو۔ حریتِ فکر کا گلا کس طرح گھونٹا جاتا تھا، اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں میں سے بعض نے علی وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰؑ کا دعویٰ برحق ہے، اور انہوں نے اس کا اعلانیہ اقرار کر لیا۔ اس پر فرعون گرج کر بولا کہ ہیں! تمہاری یہ جرأت کہ میری اجازت کے بغیر ہی تم موسیٰؑ پر ایمان لے آئے ہو؟ اب دیکھو، میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں! میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر صلیبوں پر چڑھاتا ہوں ...... (۲۶/۴۹)۔ جب اس کا یہ جبر خود اپنی قوم کی مقرب شخصیتوں کے ساتھ تھا۔ تو بنی اسرائیل کے ساتھ وہ جو کچھ کرتا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ملوکیت کسی قسم کی آزادی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی! قرآن کریم نے انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز خصوصیت یہ بتائی ہے کہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵/۳-۴)۔ انسان کو قوت گویائی دی۔ اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴)۔ اسے لکھنے کی صلاحیت عطا کی۔ ملوکیت، اپنے محکوموں کی ان صلاحیتوں کو سلب کر کے، انہیں حیوانی سطح پر لے آتی ہے۔ اور پھر ان انسان نما حیوانوں کو لٹھ کے زور پر جس طرح جی چاہے ہے ہنکاتی رہتی ہے۔

ہمارے پیشِ نظر (اس وقت) نہ تو ملوکیت کی تاریخ بیان کرنا ہے اور نہ ہی یہ بتانا کہ ملوکیت کے ان انسانیت کُش حربوں کے علی الرغم محکوم قوم کو حصولِ آزادی کی خاطر کیا کرنا چاہیے۔ نہ ہی ہمیں خود اپنی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کو یہ بتلانے کے لئے سامنے لانا ہے کہ ملوکیت کے خلاف کہیں سے کوئی آواز اٹھی تھی یا نہیں، اور اگر اٹھی تھی تو اس کا حشر کیا ہوا تھا۔ ہمیں تو صرف جسٹس جاوید اقبال کی اس دلیل کا بودا پن واضح کرنا ہے کہ چونکہ ملوکیت (بالخصوص موروثی ملوکیت) کے خلاف اُمت نے بغاوت نہیں کی (نہ ہی وہ اب ایسا کر رہی ہے) اس لئے (یہ ثابت ہوا کہ) ملوکیت خلافِ اسلام نہیں۔

ہم جسٹس موصوف (اور ان کے ساتھ محترم سید صباح الدین صاحب) کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں، کہ کسی نظریہ یا مسلک کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کے لئے سند، نہ کسی کا قول ہے، نہ عمل۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق، جائز اور اسلامی ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل، ناجائز اور غیر اسلامی ہے۔ ملوکیت (یعنی قوت کے بل بوتے پر اقتدار پہ قابض ہو جانا) یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ اگر اس کے خلاف صدائے احتجاج نہیں اٹھی یا بغاوت نہیں ہوئی تو اس سے وہ اسلامی نہیں ہو جاتی۔ جن لوگوں کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے تھی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲/۱۴۱) جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تم

پر، ہم تم سے پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ خدا کا ارشاد یہ ہے کہ اور ان حضرات کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر ان لوگوں نے باطل کے خلاف لب کشائی یا سرکشی نہیں کی تھی (یا آج بھی نہیں کر رہے) تو اس سے باطل، باطل نہیں رہا تھا، حق ہو گیا تھا۔ اگر ان کی یہ دلیل صحیح تسلیم کر لی جائے تو دنیا میں حق کا نام ہی باقی نہ رہے۔ اصل یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم یہ کہنے کی جرأت کریں کہ گذشتہ تیرہ سو سال میں جو کچھ خلافِ اسلام ہوا ہے وہ غلط اور ناجائز تھا، ہم اسے عین مطابق اسلام قرار دے رہے ہیں۔

(۰)

آخر میں ہم چند الفاظ جریدہ اقبالؔ ریویو اور اس کے توسط سے خود اقبالؔ اکادمی کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں۔ اقبال اکادمی قائم اس لئے کی گئی تھی کہ یہ علامہ اقبالؒ کی فکر کی نشر و اشاعت کرے۔ اور اسی مقصد کے لئے جریدہ اقبالؔ ریویو شائع کیا گیا تھا۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں اربابِ اکادمی سے کہ کیا یہی ہے وہ فکرِ اقبالؒ جسے اس طرح شائع کیا جا رہا ہے؟ جو کچھ زیرِ نظر تبصرہ میں کہا گیا ہے، فکرِ اقبالؔ ہی نہیں، وہ تو نفسِ اسلام کے اصول و اساسات کی جڑ تک کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ کیا اقبالؔ ریویو کے اربابِ حل و عقد کا فریضہ اتنا ہی ہے کہ انہیں جو کچھ (رطب و یابس) موصول ہو، اسے اسی طرح اٹھا کر رسالہ میں چھوڑ دیا جائے؟ یا صورت یہ ہے کہ جو کچھ اس تبصرہ میں کہا گیا ہے، وہ خود بھی اس سے متفق ہیں؟ کیا وہ بھی اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کو خلافِ اسلام، اور ملوکیت کو مطابق اسلام سمجھتے ہیں؟ اگر صورتِ حال ایسی ہی ہے تو پھر وہ ذرا کھل کر سامنے آئیں تاکہ قوم ان کی طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔

(۰)

۲۔ وفاقی شرعی عدالت میں پیش ہونے والے حضرات

بعض (اسلام کا درد دل میں رکھنے والے) حضرات مروجہ غیر اسلامی قوانین کو چیلنج کرنے کے سلسلہ میں وفاقی (یا سپریم کورٹ کی) شرعی عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ وہاں اس قسم کی الجھنیں سامنے آتی ہیں جن کی وجہ سے اصلی سوال ان کے غبار میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں (جو وہاں پیش ہوتے ہیں) گذارش کریں گے کہ وہ اصل سوال تک آنے سے پہلے، ذیل کے بنیادی سوالات کے جوابات متعین کرا لیں۔ اس سے اصل مسئلہ بآسانی حل ہو جائے گا۔

۱۔ سوال تنقیح طلب یہ ہے کہ زیرِ نظر قانون اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ کیا یہ بتایا جائے گا کہ کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے معیار یا اتھارٹی کیا ہے۔

جواب ملے گا کہ جو قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غیر اسلامی ہے۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ کتاب سے تو مراد قرآن مجید ہے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ علیہ طور پر کتاب اللہ ہے۔ کیا یہ بتایا جائے گا کہ وہ کون سی کتاب ہے جس کے مندرجات تمام مسلمانوں کے نزدیک... متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ ہیں؟

جواب ملے گا کہ سنت، حدیث کی کتابوں میں مندرج ہے۔ ان میں چھ کتابیں سنیوں کے نزدیک مستند ترین ہیں۔ یعنی بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔

۳ - سوال کیا ان کتابوں میں لکھی ہوئی ہر حدیث سنت ہے اور تمام سنیوں کے نزدیک متفق علیہ، یعنی کیا اسے ہر سنی مستند سنت رسول اللہ تسلیم کرتا ہے یا ان میں باہمی اختلاف ہے۔ اگر ان میں اختلاف ہے تو پھر متفق علیہ مجموعۂ سنت کونسا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو یہ سوال طے ہی نہیں ہو سکتا کہ فلاں قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب (غالباً یہی) ملے گا کہ اس کا فیصلہ ہم کریں گے کہ فلاں بات سنت ہے یا نہیں؟

۴ - اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ دستور کی رو سے اس عدالت کا فریضہ یہ ہے کہ زیر نظر قانون کے متعلق طے کرے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب و سنت، عدالت کے پاس پہلے سے موجود ہیں جن کے مطابق انہیں فیصلے کرنے ہیں۔ یہی اصول ہر عدالت کا ہوتا ہے کہ اس کے پاس وہ ضابطہ قوانین موجود ہوتا ہے جس کے مطابق انہیں متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے، یہ فریضہ مقننہ کا ہے کہ وہ متعین کرے کہ عدلیہ کو فلاں ضابطہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنے ہوں گے۔ عدلیہ کے پاس اگر وہ ضابطہ (سنت کا متفق علیہ مجموعہ) نہیں ہے جس کے مطابق انہوں نے متنازعہ امور کا فیصلہ کرنا ہے تو انہیں وہ ضابطہ مقننہ سے حاصل کرنا چاہئے۔ اس ضابطہ کے بغیر تو یہ بحث ہی نہیں ہو سکتی کہ زیر نظر قانون سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟

جواب دیا جائے گا کہ قرآن مجید ایک ضابطہ احکام موجود ہے۔ لیکن اس کے احکام میں بھی تاویل و تشریح کی گنجائش ہوتی ہے یہی صورت سنت کی سمجھ لیجئے۔

۵ - سوال: ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب قرآن کی کوئی آیت پیش کی جاتی ہے تو بحث طلب امر یہ نہیں ہوتا کہ وہ قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ ہر مسلمان اسے قرآن کی آیت تسلیم کرتا ہے۔ لیکن جب کسی بات کو حدیث یا سنت کہکر پیش کیا جائے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی سنت ہے بھی یا نہیں۔ اور ساری بحث اسی محور کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ عدلیہ کے پاس (قرآن کی طرح) ایک ایسی کتاب کا ہونا ناگزیر ہے جس میں مندرج سنت تمام مسلمانوں کے نزدیک مستند اور مصدق سنت ہو۔ اس کے بعد سوال یہ نہیں پیدا ہوگا کہ فلاں سنت، سنت ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ساری بحث قرآن کی آیت اور اس سنت کے گرد گھومیگی اور یوں یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ زیر نظر قانون، کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ موجودہ حالات میں تو کوئی مقدمہ بھی، دستور اور قانون کی روشنی میں شرعی عدالتوں میں چل ہی نہیں سکتا کیونکہ ان کے پاس ضابطہ قوانین (سنت) کی ایسی کتاب ہے ہی نہیں جسے فیصلہ کا معیار قرار پانا ہے۔

آپ ان سوالات کو پورے اعتماد کے ساتھ اٹھایئے کیونکہ اس وقت پاکستان ہی نہیں، کسی ملک میں بھی کوئی ایسا مجموعہ موجود نہیں جسے تمام مسلمان مستند سنت تسلیم کریں۔ سنت کا مجموعہ تو ایک طرف، سنت کی ——— (DEFINITION) تک متفق علیہ نہیں۔ ایک فریق کے نزدیک ہر حدیث سنت ہے۔ دوسرے کے نزدیک حضورؐ کے صرف وہ اعمال سنت ہیں جنہیں آپؐ نے بہ حیثیت رسول سرانجام دیا، اور التزاماً سرانجام دیا۔ اور حدیث کے کسی مجموعہ میں یہ وضاحت نہیں کہ حضورؐ نے کس کام کو بہ حیثیت رسول سرانجام دیا تھا۔ ہر فرقہ جن امور کو چاہے سنت قرار دے لیتا ہے۔ لیکن کسی قانون کو کتاب و سنت کے مطابق قرار دینے کے لئے تو اس سنت کی ضرورت ہوگی جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر سنت تسلیم کریں۔ ایسا مجموعہ کہیں موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ارباب مذہب نے اس سوال کو ایسا نازک بنا رکھا ہے کہ جو نہی کسی نے اسے چھیڑا انہوں نے اسے "منکرِ حدیث" قرار دے کر معاملہ ختم کر دیا لیکن اب تو اس سوال نے آئینی اور قانونی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اس لئے وفاقی شرعی عدالت کے جج صاحبان۔ حکومت کی وزارتِ قانون اور وزارتِ امورِ مذہبیہ۔ نیز ملک کے قانون دان طبقہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بنیادی مسئلہ کو حل کریں تاکہ قانونی مسائل اس گرداب سے نکل سکیں جس میں وہ اس وقت بری طرح پھنس رہے ہیں۔

شرعی وفاقی عدالت سے یہ بھی پوچھئے کہ اگر ایک قانون قرآن کے خلاف اور سنت کے مطابق ہو تو اسے اسلامی قرار دیا جائے گا یا غیر اسلامی؟

۳۔ ایران و عراق کی جنگ

ایک صاحب، دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ ایران اور عراق، اور اسلامی ممالک کی جنگ قریب دو سال سے جاری ہے۔ دیگر اسلامی ممالک ان میں صلح کرانے کی کوششیں بھی کر رہے ہیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اس میں، علاوہ دیگر نقصانات کے، کثیر التعداد افراد کا بھی قتل ہو رہا ہے حالانکہ قرآن مجید کی رو سے کسی ایک مومن کا قتل عمد بھی، خدا کے غضب، لعنت، عذاب عظیم اور جہنم کا مستوجب بنا دیتا ہے۔ (سورۃ النساء آیت ۹۳) کیا قرآن مجید نے اس کا کوئی علاج نہیں بتایا؟

طلوع اسلام: قرآن مجید نے اس کا علاج بتایا ہے لیکن وہ علاج ان مسلمانوں کے لئے ہے جو اسلامی نظام کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اسلامی نظام سے مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان، ایک اُمّت (اُمّتِ واحدہ) کی حیثیت سے ایک مرکزی اتھارٹی کے تحت زندگی بسر کریں۔ اس نظام میں افرادِ اُمّت باہمی بھائیوں کی طرح رہیں گے لیکن بایں ہمہ، مناقشت کے کسی امکانی واقعہ کی صورت کے متعلق کہا ہے:۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ (۴۹/۹)

اگر کبھی سوءِ اتفاق سے ایسا ہو کہ) مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد، ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو تم، اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو تاآنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانونِ خداوندی کی رو سے کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے تو ان میں عدل اور انصاف کی رو سے پھر صلح کرا دو۔ اور ہمیشہ انصاف کو ملحوظ رکھو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے بڑی مستحسن ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ "تم ان میں صلح کرا دو" تو اس سے مراد اسلامی مملکت (امت کی مرکزی اتھارٹی) ہے جو اس قدر صاحبِ قوت ہوتی ہے کہ اس کے فیصلوں کے خلاف سرکشی کرنے والوں کی

سرکوبی کی جاسکتی ہے۔

یہ تھا اسلامی مملکت میں متحارب گروہوں کی باہمی منافقت کا مسئلہ حل کرنے کی صورت جس دن اُمّت کی یہ مرکزی اتھارٹی ختم ہوگئی، اسلام عملاً باقی نہ رہا۔ پھر مسلمان ایک قوم رہ گئے اور دنیا کی دیگر قوموں کی طرح، مختلف ممالک (اور اقوام) میں بٹ گئے۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم اپنے باہمی معاملات یا دیگر مسلمانوں کے ممالک کے معاملات پر غور و فکر کرنے کے لئے اسلام کا نام خواہ مخواہ درمیان میں لے آتے ہیں۔ جب اسلام دنیا میں کہیں موجود ہی نہیں تو اسلام کا نام لینے سے کیا فائدہ؟ اسلام نام ہے ایک اُمّتِ واحدہ، اس کا ایک ضابطہ، قوانین (قرآن) اور ایک مرکزی اتھارٹی (اسلامی مملکت)۔ جب یہ نہیں تو اسلام بھی نہیں۔ اب مسلمان نام رکھانے والی قوم کے مختلف ممالک ہیں، اور بس۔

(ضمناً) جو آیت اوپر درج کی گئی ہے اس میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں اسلامی مملکت کے فیصلہ کو "امراللہ" (خدا کا حکم) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس کا فیصلہ، خدا ہی کے قانون (قرآنِ مجید) کے مطابق ہوتا ہے۔

———— (۰) ————

(۴)۔ اسرائیل

ہمارے اس دوست نے، ان تباہیوں اور بربادیوں۔ ہلاکتوں اور خونریزیوں پر بھی خون کے آنسو بہائے ہیں جو مسلمان آبادیوں کے خلاف، اسرائیل کے ہاتھوں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک قریب ایک ارب مسلمانوں کا بحرِ ذخار ہے جس میں اسرائیل کی مملکت ایک حباب کی مانند ہے۔ لیکن اس "حباب" کی کیفیت یہ ہے کہ وہ سارے کے سارے بحرِ ذخار پر چھایا رہا ہے اور یہ ایک ارب آبادی اس کے سامنے بے دست و پا ہے۔ کیا ان کا مسلمان ہونا ہی ان کا جرم ہے؟

طلوعِ اسلام: جی نہیں! ان کا مسلمان ہونا ان کا جرم نہیں۔ مسلمان نہ ہونا اور مسلمان کہلانا ان کا جرم ہے۔ مسلمانوں پر تو غیر مسلم کبھی غالب نہیں آسکتے۔ یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)

خدا کبھی غیر مسلموں کو مومنین پر غالب نہیں آنے دے گا۔

بات واضح ہے۔ اگر غیر مسلم مسلمان نام رکھانے والی قوم پر غالب آجاتے ہیں، تو وہ قوم معیارِ خداوندی کی رو سے مومن نہیں ہے۔ ہمیں ان معاملات پر مختلف قوموں کے مابین معاملات کی حیثیت سے غور کرنا چاہئیے یہ کہ مسلمانوں (مومنین) اور غیر مسلموں (کفار) کے معاملات کی حیثیت سے۔ پھر نہ کوئی گلہ ہوگا، نہ شکوہ۔ نہ التباس ہوگا نہ اعتراض۔

———— (۰) ————

۵۔ یا مشرک بنو یا نقصان اٹھاؤ!

آپ کو یاد ہوگا کہ زکوٰۃ کے مروجہ آرڈی نینس کی رُو سے، جو لوگ یہ ڈیکلریشن داخل کر دیں کہ وہ فلاں فرقہ (یا فقہ) کے پابند ہیں، انہیں زکوٰۃ سے مستثنےٰ قرار دے دیا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے ڈیکلریشن میں لکھ دیا کہ وہ قرآنی فقہ کے پابند ہیں۔ انہیں جواب ملا کہ

زکوٰۃ اور عشر آرڈی نینس کی متعلقہ شق کے مقاصد کے لئے جو پانچ فقہیں تسلیم کی گئی ہیں، قرآنی فقہ ان میں شامل نہیں۔

لہٰذا، آپ زکوٰۃ سے مستثنےٰ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ (یہ خط و کتابت طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔)

اب قارئین میں سے ایک صاحب نے (جنہوں نے اپنے ڈیکلریشن میں لکھا تھا کہ

میں مسلمان ہوں۔ قرآن کا متبع ہوں۔ اور کسی فرقہ (فقہ) سے متعلق نہیں ہوں۔)

اس جواب کی نقل ارسال فرمائی ہے جو انہیں ان کے بینک کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہے:۔

جہاں تک شریعت کے پرسنل لا کا تعلق ہے، مفروضہ یہ ہے کہ متعلقہ شخص حنفی فقہ کا پابند ہے، تاآنکہ اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ جہاں تک کسی کے معتقدات کا تعلق ہے، اس پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا، لیکن جہاں تک معاشرتی روابط میں مسلم لا کے اطلاق کا تعلق ہے، اسے کسی نہ کسی فقہ کو اختیار کرنا ہی ہوگا۔

کیا کہنے ہیں اس اسلام کے جو اس ملک میں رائج کیا جا رہا ہے؟ اعتقاداً ایک شخص فقہ حنفی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن زکوٰۃ سے ریفنڈ کے لئے اسے ڈیکلریشن دینا ہوگا کہ وہ فقہ حنفی کا پابند ہے۔ یا وہ یہ منافقت برتے (اور قرآن کی رُو سے مشرک بھی قرار پائے) اور یا مالی نقصان اٹھائے؟

جو سعادتمند حضرات نقصان اٹھانا گوارا کر رہے ہیں لیکن نہ اس قسم کی منافقت اختیار کرنا چاہتے ہیں، نہ شرک کے مرتکب ہونا۔ ہم انہیں مستحق تبریک و تہنیت قرار دیتے ہیں۔

—(○)—

۶۔ تصویر کی شرعی حیثیت

حکومت پاکستان نے قائد اعظمؒ کا پورٹریٹ (تصویر) بنوانے کی تجویز کی تو اس پر ہفت روزہ دارالاعتصام لاہور نے اپنی ۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسب ذیل اداریہ سپرد قلم فرمایا:۔

اس خبر اور فیصلے پر ملک کے مذہبی حلقوں نے شدید برہمی کا اظہار کیا تھا اور مذہبی اخبارات نے بھی اس کے خلاف اسلامی احکام کی نشاندہی کی تھی کہ تصویر سازی اسلام میں ایک سخت کبیرہ گناہ ہے جس پر بڑی سخت وعید رسول اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ ایسے واضح خلاف شریعت، فعل

کے لئے حکومت کا فیصلہ سخت تعجب انگیز ہے۔

ہم اربابِ اعتصام سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ارضِ پاک حجاز تشریف لے گئے ہیں؟ وہاں انہیں سرِ ہوٹل اور دیگر نمایاں مقامات پر شاہانِ سعودیہ کے بڑے بڑے پورٹریٹ (تصاویر) آویزاں دکھائی دیں گے۔ کیا اہلِ اعتصام نے کبھی ان کے خلاف بھی کچھ لکھا ہے یا کہا ہے؟ ارضِ حجاز کو تو یہ حضرات شریعتِ حقّہ کا گہوارہ اور وہاں کے بادشاہوں کو محی الملّت والدین (دین اور ملّت کے زندہ کرنے والے) بتایا کرتے ہیں۔

(٠)

۷۔ قرآنِ خالص

(کالعدم) جماعتِ اسلامی کے ترجمان ہفتہ وار ایشیا کی ۱۲ اپریل کی اشاعت میں ہے:-

قرآن مجید کی ان تمام صفات کی بنا پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ زمانے میں جو فتنہ آنے والا ہے اس سے بچانے والی چیز سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہوگی۔

یہی بات ہم نے کہی تو ہمیں ان حضرات کی طرف سے "مخبوط الحواس اور دائرۂ اسلام" سے خارج قرار دیا گیا۔

(٠)

۸۔ مرنے کے بعد

ایک صاحب کا، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۵ مئی ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ایک خط شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "عورت کی فطری کمتری" اس میں تحریر ہے:-

عورتوں کے فضائل اور حقوق کے بارے میں تفسیر جامع البیان سے اشاعت کے لئے اقتباسات پیش ہیں۔ امید ہے کہ جملہ شبہات کا سدِباب ہوگا اور صحیح مقام حقوق کے متعلق منظرِ عام پر آکر ازالہ تفہیمات کا موجب ہوگا۔ تفسیر جلالین و جامع البیان صفحہ ۹۶ ملاحظہ ہو۔

اس کے بعد عورتوں کے حقوق کے متعلق تو ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ کہا یہ گیا ہے کہ عورت، یہ نہیں ہو سکتی اور وہ نہیں ہو سکتی، اسے چھوڑ دیجئے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک، جو حضرات دنیا سے جا چکے ہیں، وہ سند ہو جاتے ہیں۔ یہ خود بھی زندہ ہوں تو سند نہیں ہوتے ــــ مرنے کے بعد سند ہو جاتے ہیں ــــ ہر مردہ پرست قوم کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ضرورتِ رشتہ

ایک نہایت سلیقہ شعار، خوش شکل (عمر ۱۸ سال) لڑکی جو چند ماہ پیشتر زمانے کی چیرہ دستیوں کی بنا پر مطلقہ ہو چکی ہے کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ رابطہ کے لئے (م ۔ ا)

معرفت ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی ۔ گلبرگ نمبر ۲ ۔ لاہور

نوادرات

(ہمارے ایک ـــــ ذی علم، صاحبِ فکر، قرآنی دوست، انگلستان میں مقیم ہیں ـــــ انہوں نے پرویز صاحب سے چند ایک اہم نکات کی وضاحت چاہی تھی جسے انہوں نے ایک خط میں تحریر فرمادیا تھا۔ یہ خط، مکتوب نگار اور مکتوب علیہ تک ہی محدود تھا لیکن ہم نے جب اس کے مندرجات پر نگاہ ڈالی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسے، انہی دو تک محدود رکھنا بخیلی ہوگا، رزاقی نہیں۔ اس کی اشاعت عام ہونی چاہیئے۔ بنابریں، اسے، دو ایک (ذاتی نوعیت کے) فقرات حذف کرکے، اور پرویز صاحب کی اجازت سے، حوالۂ طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد قارئین ہم سے متفق ہوں گے کہ ہمارا یہ فیصلہ کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جانا چاہیئے ـــ نامناسب نہیں تھا۔)

اب وہ خط ملاحظہ فرمائیے۔　　(طلوعِ اسلام)

ـــــــ (۰) ـــــــ

محترمی السلام علیکم!

علامہ اقبالؒ سے متعلق اُلجھنوں کو تو "تصوّف کی حقیقت" نے دُور کر دیا۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک ـ اصل یہ ہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جہاں وحی کی ضرورت، نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انسان کتنا ہی بڑا دانشور، مصلح، مفکر کیوں نہ ہو، اس کا خود اپنے داخلی یا خارجی مؤثرات سے متاثر ہوجانا امکانات پر اثر ہوتا ہے۔ یہ صرف وحیٔ خداوندی ہے جو کسی مؤثر سے متاثر نہیں ہوتی۔ خالص (OBJECTIVITY) صرف وحی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو اور نوادر اس نے خود نبیؐ سے بھی اپنی وحی پر ایمان لانے کے لئے کہا ہے۔ ایمان لانے کے معنی ہوتے ہیں وحی کو ہر معاملہ میں قولِ فیصل سمجھنا۔ نبیؐ کا بھی اپنی بشری حیثیت میں مؤثرات سے متاثر ہوجانے کا امکان تھا۔ اس لئے اسے بھی وحی سے فیصلہ لینے کے لئے کہا۔ جب وہ تبلیغِ وحی کرتا تھا تو اس میں (SUBJECTIVITY) کا قطعاً دخل نہیں ہوتا تھا۔ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی۔ لیکن جب وہ کچھ اپنی طرف سے کہتا تو اس میں مختلف مؤثرات کے (شعوری یا غیرشعوری طور پر) اثرانداز ہوجانے کا امکان ہوتا تھا۔ خدا نے جب مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا ہے (۴/۱۳۶) تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جملہ امور میں قولِ فیصل وحی کو قرار دیں، نہ کہ کسی

شخصیت کو ان کے لئے راہِ صواب یہی ہے کہ وہ بڑی سی بڑی شخصیت کے افکار و اقوال کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں۔ جو اس کے مطابق ہو اُسے قابلِ قبول سمجھیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیں۔ اس استرداد سے اس شخصیت کی سُبکی نہیں ہو جاتی۔ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ ہم اسے صاحبِ وحی نہیں سمجھتے۔ اگر وہ (یا اُن کے معتقدین میں سے کوئی) اسے بُرا مناتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو (یا معتقدین انہیں) صاحبِ وحی تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ اپنی زندگی کے اوّلین سانس سے لے کر آخری سانس تک، ہر حال میں نبیؐ تھے۔ یعنی آپ کا ہر قول و عمل مبنی بر وحی ہوتا تھا، اور اس کے ساتھ اُن کے ہاں اس قسم کی روایات بھی ہیں کہ (مثلاً) حضورؐ ایک دفعہ ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپؐ نے دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا اس نماز کی چار رکعتوں کی بجائے دو رکعتیں رہ گئی ہیں؟ پہلے تو آپؐ نے پوچھا کہ کیا میں نے دو رکعتیں پڑھی ہیں؟ اور جب اس کی توثیق ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ میرا سہو تھا۔ نماز دوبارہ پڑھی جائے گی۔ یہ تو صحابہ رضؓ کی روشن ضمیری تھی کہ وہ حضورؐ کی نبوی اور بشری زندگی میں فرق ملحوظ رکھتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اس واقعہ پر خاموش رہتے تو حضورؐ کا وہ سہو آنے والوں کے لئے، دین بن جاتا۔ صحابہؓ کبار کی تو یہ کیفیت تھی اور ہماری شخصیت پرستی کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ذرا سا بھی واجب الاحترام ہو، اُس کی کسی بات پر تنقید کرنا، کفر اور الحاد قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارا (مروّجہ) اسلام شخصیتوں کے افکار و اعمال کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ دینِ خداوندی کا اس میں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک کسی کا احترام و تکریم اسی حد تک ہونا چاہیئے جس حد تک اس کی فکر، قرآنی حقائق سے ہم آہنگ، اور اُس کا کردار قرآنی معیار کے مطابق ہو۔ میں نے "تصوّف کی حقیقت" میں اسی اصول کو مدِّنظر رکھا ہے۔

۳۔ اب آیئے اپنے دوسرے نکتہ کی طرف۔ یعنی قرآن کے معاشی نظام میں ذاتی ملکیت اور عبوری دَور سے متعلق احکام کی حیثیت۔ سب سے پہلے عبوری دَور سے متعلق احکام کو لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے بالغ نظر، صاحبِ فکر و دانش کے لئے یہ سمجھنا قطعاً دشوار نہیں ہوگا کہ قرآن اپنے نظام کو محض احکام و قوانین کے ذریعے، میکانکی طور پر قائم نہیں کرتا۔ بنابریں عبوری احکام کے یہ معنی نہیں کہ وہ منتہی احکام کی تدریجی شکل ہیں اور بس۔ قرآن کا اصل مقصود، انسانیت سازی ہے۔ اور وہ جس قدر نظام ہائے حیات قائم کرتا ہے۔ (معاشرتی۔ سیاسی۔ معاشی۔ عمرانی وغیرہ) وہ مقصود بالذّات نہیں۔ یعنی اس سے کائناتی فضا یا انسانی دنیا کو یہ دکھانا مقصود نہیں کہ خدا کے نظام کس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں۔ یہ تمام نظام درحقیقت، انسانیت سازی (یا غالب کے الفاظ میں آدمی کو انسان بنانے) کے ذرائع ہیں۔ اقبالؒ نے قرآن کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر آپ ذرا غور کیجئے کہ جن افراد کو سطحِ آدمیت سے اٹھا کر مقامِ انسانیت تک پہنچانا مقصود تھا، جب اس پروگرام کی ابتداء کی گئی تھی تو اُن کی تمدّنی اور معاشرتی سطح کیا تھی؟ خود قرآن کی شہادت کی رُو سے انہیں یہ بھی بتانا، سکھانا اور سمجھانا پڑتا تھا کہ

(۱) جب کسی کے ہاں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو دروازے کے باہر سے آواز دینی چاہیئے۔

(۲) کسی کے ہاں جانا ہو تو پہلے اس سے اجازت لینی چاہیئے۔

(۳) اگر کوئی کھانے کے لئے بلائے تو ایسا نہ کرو کہ ابھی اس کے ہاں ہانڈیاں چولھے پر رکھی ہوں، اور تم وہاں براجمان ہو جاؤ۔

(۴) محفل میں بیٹھو تو اس طرح کہ جب کوئی اور آجائے تو اس کے لئے جگہ نکال دو۔

(۵) چیخ چیخ کر نہ بولا کرو۔

(۶) اکڑ اکڑ کر نہ چلا کرو۔

(۷) آپس میں بے ہودہ تمسخر نہ کیا کرو۔

(۸) ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام نہ رکھا کرو۔

(۹) خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔

(۱۰) کسی کی غیبت نہ کیا کرو۔

(۱۱) دوسروں سے متعلق حسنِ ظن سے کام لیا کرو۔

(۱۲) یونہی، بلا تحقیق افواہیں نہ پھیلایا کرو۔

(۱۳) نہ ہی سرگوشیاں کیا کرو۔

یہ تھی ان لوگوں کی معاشرتی سطح۔ حضری آبادیاں قدرے گوارا تھیں، لیکن ایک تو وہ بہت قلیل تھیں اور دوسری طرف وہ نسلی تفاخر، زیردستوں پر مظالم، سرمایہ پرستی۔ بربریت کے نشہ میں بدمست تھیں۔ اکثریت انہی کی تھی جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

سیاست میں اِن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مملکت یا نظامِ حکومت کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ زندگی قبائلی تھی جس میں پنچایت کی رُو سے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے ہو جاتے تھے۔ اور اگر کہیں جنگ چھڑ جاتی تھی تو سو سو سال تک صلح کرانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نسلی اشتراک کے سوا کسی معیارِ اجتماعیت سے واقف نہ تھے۔

جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، غنیمت (یعنی لوٹ) ان کا بنیادی ذریعہ رزق تھا۔ طبقۂ بالا کے معدودے چند افراد، تجارت بھی کرتے تھے اور سودی کاروبار بھی۔ اور کعبہ کے متولی ہونے کی بناء پر قریش کا ذریعہ معاش مذہبی پیشوائیت تھا۔ بس یہ تھی ان کی زندگی۔ یہ تھا وہ خام مال...... (RAW MATERIAL) جسے تعلیم و تربیت سے قرآنی قالبوں میں ڈھال کر، بتدریج احسن تقویم کی سطح پر لے جانا مقصود تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے چار طریقے ہو سکتے ہیں :-

(۱) بطور خیرات لینا۔

(۲) قوت کے زور پر کسی سے کچھ چھین لینا۔ اس میں چوری اور ڈاکہ ہی نہیں آتا۔ ہر قسم کا سلب و نہب اور استحصال بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔

(۳) چھپر پھاڑ کر کچھ مل جانا، جیسے وراثت میں ڈھیروں مال مل جانا، یا زمینی ذخائر کا بیٹھے بٹھائے مل جانا، جیسے عرب میں تیل کے ذخائر مل گئے ہیں۔ اور،

(۴) محنت سے کچھ پیدا کرنا۔

عربوں کے ہاں پہلے تین ذرائع رزق ہی متداول تھے۔ اور قرآن کا منتہیٰ ان تینوں کو بند کر کے صرف چوتھے دروازہ کو کھولنا تھا۔

مختصراً یہ تھے وہ فضائے جاہلیت کے پروردہ عرب جو اسلام کی درسگاہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور جنہیں وہ قوم بنانا مقصود تھا جو اس کے نظامہائے حیات کے قائم کرنے کی اہل ہو ـــــــ نہ صرف ملک عرب میں ان نظاموں کے قیام اور استحکام کی اہل، بلکہ ایسی اُمّۃً وَّسَطًا جو شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہو۔

آپ سوچیے کہ ایسی فضا میں پروان چڑھے ہوئے ان افراد کو اُس معیار پر پہنچانا تعلیم و تربیت کا کس قدر تدریجی عمل چاہتا تھا۔ قرآن نے اس پروگرام کو اَلْعَقَبَۃ کہہ کر پکارا ہے۔ (۹۰/۱۲) العقبۃ کے معنی ہوتے ہیں "پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا" پہاڑ کی گھاٹی پر دوڑ کر نہیں چڑھا جا سکتا۔ اس پر قدم قدم چڑھنا پڑتا ہے، اور ہر قدم پر جس قدر سانس پھولتی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو کبھی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھا ہو ـــــــ کوہ پیماؤں کی طرح رسّے باندھ کر نہیں، بغیر سہاروں کے قدم قدم۔

یہ گھاٹی ہے کیا؟ فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) خود بھی ہر قسم کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا، اور نوعِ انسان کو بھی آزادی دلانا: (یعنی جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے)۔

(۱) خوراک کی قلت کے زمانے میں بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرنا۔ (۹۰/۱۴)

(۲) ہر اس فرد کا مونس و غمخوار بننا جو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ (۹۰/۱۵)

(۳) مٹی میں لتھڑے ہوئے جس مزدور کو اتنا نہ ملے جس سے اس کی زندگی کی حرکت قائم رہ سکے، اس کی رکی ہوئی گاڑی کے چلانے کا انتظام کرنا۔ (۹۰/۱۶)

اس گھاٹی پر چڑھنے کا مرحلہ بڑا صبر طلب ہوگا۔ اس کے لئے ایسی جماعت کی ضرورت ہوگی جس کا ہر فرد دوسرے افراد کو استقامت کی تلقین کرے، اور یہ سب ایک دوسرے کا بازو تھامے آگے قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ (۹۰/۱۷)

یہ تھی وہ گھاٹی جس پر چڑھنے کے لئے ان افراد کو تیار کرنا تھا۔

اِن تصریحات سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ان افراد کی اسی تیاری (تعلیم و تربیت اور نشو و نما) کے دور میں، منتہائی قوانین میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا ہی مقصود نہیں تھا جو انہیں ممکن العمل بنا دیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ تبدیلیاں ایسی ہوں جو ان افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما بھی کرتی جائیں تاکہ جب قانون کے اگلے درجہ میں پہنچیں (درجۃ کے معنی ہی سیڑھی کا اگلا ڈنڈا ہوتے ہیں) تو ان کے اپنے اندر بھی مناسبِ حال تبدیلی پیدا ہو چکی ہو۔ سورۂ بقرہ میں اِن افرادِ مؤمنین کی جو دعائیں مذکور ہیں، اِن میں یہ دعا بھی ہے: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ..... ($\frac{۲}{۲۸۶}$)۔ اِس کا عام طور پر ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں ہمت نہ ہو"۔ اس ترجمہ سے خدا کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے، اُس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! جس قدر بوجھل ذمہ داری ہم پر ڈالی جائے، اُس کے اٹھانے کے مطابق ہمیں قوت اور ہمت بھی حاصل ہو۔ جوں جوں ان کی اطاعت کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی تھیں، اُس کے مطابق ان کی صلاحیتیں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

یہ ہے اس نظام کا عبوری دور۔ چونکہ آپ نے صرف معاشی نظام کا ذکر کیا ہے، اِس لئے میں اس کی چند ایک ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہو کہ عبوری دور میں، منتہائی قوانین میں جو مراعات ملحوظ رکھی گئی تھیں، ان سے ان افراد کی سیرت میں کس طرح وہ تبدیلیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں جن سے وہ اس نظام کو، اس کی انتہائی شکل میں قائم کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

(۱) خیرات

اِس معاشرہ میں، پست و بالا۔ امیر و غریب کا طبقاتی تفاوت بڑا شدید تھا۔ ایسا شدید کہ زیردستوں کو انسانی سطح پر سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسے معاشرہ میں، غریبوں اور محتاجوں کی مدد کا ذریعہ خیرات تھا۔ خیرات میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں لینے والے کی عزتِ نفس کو سخت ٹھیس لگتی ہے، اور دینے والے میں تکبر و نخوت کے جذبات اُبھر آتے ہیں، اور وہ مفلسوں اور محتاجوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ قرآن کو بھی، اپنے عبوری دور میں، محتاجوں کی امداد کا طریق بہر حال یہی رکھنا تھا، لیکن اس نے اسے ایسی شرائط سے مشروط کر دیا جس سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہوں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ (ضمناً۔ اُس نے مروّجہ معنوں میں خیرات کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ صدقہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے بنیادی معنی اپنے وعدہ یا معاہدہ کو سچا کر دکھانا ہے۔ اس اصطلاحی تبدیلی سے ہی اس کے مفہوم میں فرق پیدا ہو گیا)۔ اُس نے اِس قسم کی مدد دینے والوں سے کہا کہ جن کی مدد کرو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دو: لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ($\frac{۷۶}{۹}$): ہم اِس کے بدلے میں تم سے کوئی صلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی

متمنی نہیں“۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے قرآن نے اِن میں کتنا بڑا تغیّرِ نفس پیدا کر دیا۔ دوسری جگہ کہا کہ اگر تم نے اِس کا ذرا سا احسان بھی جتایا، یا کوئی اور ایسی حرکت کی جس سے اِن غریبوں کو قلبی اذیت پہنچے تو یاد رکھو! تمہارا کیا کرایا سب باطل ہو جائے گا۔ (۲۶۲-۲۶۴/۲) اِن کے لئے تمہارا دعیدہ دلآزاری ہوتا تو ایک طرف، اگر تم نے یہ مدد لوگوں کو دکھانے (رِئَآءَ النَّاسِ) کی خاطر بھی کی، تو بھی یہ باطل ہو جائے گی۔

یہ تو ہوا مدد دینے والوں میں تغیّرِ نفس۔ جہاں تک لینے والوں کا تعلق ہے، اُن سے کہا کہ اسے تم "خیرات" (گداگری کے ٹکڑے) نہ سمجھو۔ یہ تمہارا حق ہے جسے تم اِن سے لے رہے ہو وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۴-۲۵/۷۰)۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ خیرات دینے والے کے دل میں، غریبوں اور محتاجوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے ایک ایسا اصول تلقین فرمایا ہے، جس سے یہ نفرت، محبت سے بدل جاتی ہے۔ محبت (LOVE) کا لفظ جس قدر کثیر الاستعمال ہے اتنا ہی مبہم المعانی ہے۔ کوئی متعین طور پر بتا نہیں سکتا کہ محبت کہتے کسے ہیں۔ عصرِ حاضر کے علم النفس نے (LOVE) کی ایسی وضاحت پیش کی ہے، جس سے اس کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، "LOVE" کے معنی ہیں "دوسرے کی خواہش یا تقاضا کو اپنے پر ترجیح دینا"۔ قرآنِ کریم نے غریبوں کی مدد کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹/۵۹) "یہ ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے"۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک (بظاہر) معاشی خصوصیت سے، قرآن کس قسم کا نفسیاتی تغیّر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ "خیرات دینے والوں" کے جذباتِ حقارت کو محبت میں بدل دیتا ہے۔

(۲)۔ حسنِ سلوک

اُس معاشرہ میں بوڑھے ماں باپ بوجھ سمجھے جاتے تھے، اور اگر اولاد ان کی مدد کرتی بھی تھی تو اُن سے بڑی درشتی سے پیش آتی تھی جس سے ان کی امداد تانِ تلخ بن جاتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اپنے عبوری دور میں، ماں باپ (بلکہ دیگر اقرباء، ہمسائیگان حتیٰ کہ ضرورت مند مسافروں تک) کی امداد کو احسان کہہ کر پکارا جس کے معنی کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کر دینا ہے۔ اور احسان کو فریضہ خداوندی قرار دیا۔ یعنی اس کا کسی کے جذبات پر انحصار نہیں رکھا، بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے والا کسی کے سر پر (ہمارے مروجہ مفہوم کے مطابق) "احسان" نہیں دھرے گا۔

(۳) یتامیٰ

یتیم کے معنی وہی بچہ نہیں جس کے ماں باپ (بالخصوص باپ) فوت ہو چکے ہوں۔

اس کے معنی وہ افراد ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ وہ معاشرہ جبر داری کا تھا، اس لئے معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے مال و دولت کو لوٹ کھسوٹ کر لیے جاتے تھے۔ قرآن نے صاحبِ قوت و ہمت افراد کو ان یتیموں کا محافظ اور پاسبان مقرر کیا، اور انہیں واجب التکریم قرار دیا (۸۹/۱۷)۔

(۴)۔ وراثت

قرآنِ کریم کا بنیادی اصول ہے: وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ وہ (UN — EARNED INCOME) کو جائز ہی قرار نہیں دیتا خواہ اس کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو۔ اس کی ایک شکل وراثت بھی ہے۔ عربوں کے ہاں عورتوں اور بچوں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا۔ بعض ممالک میں باپ کا سارا ترکہ بڑا بیٹا لے جاتا تھا۔ قرآن نے یونہی بیٹھے بٹھائے اس طرح امیر کبیر بن جانے کو ناجائز قرار دے دیا۔ (۸۹/۱۹)۔ اور ترکہ کو ایسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جس سے کثیر دولت ایک جگہ مرتکز نہ ہونے پائے (۴/۱۱-۱۲)۔ اس عبوری دور میں قرآن، اکتنازِ دولت کو روک تو نہیں سکتا تھا۔ اُس نے اس میں یہ اصلاح کی کہ دولت کی گردش اس طریق سے کی جائے کہ وہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردان نہ رہے (۵۹/۷)۔ اس طرح جب دولت کی گردش کا دائرہ وسیع ہو جائے گا تو اس کا اکتناز خود بخود رقیق ہو جائے گا۔ اس میں "بائیس خاندان" دولت کے مالک نہیں رہ جائیں گے۔

(۵)۔ مالِ غنیمت

اِن عربوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر مالِ غنیمت (لوٹ کا مال) ہوتا تھا۔ اُن کا معمول یہ تھا کہ جو جس کے ہاتھ میں آجائے، وہ اُس کا ہو جائے۔ قرآن نے اس میں یہ تبدیلی کی کہ مالِ غنیمت پورے کا پورا، امیرِ ملت کے پاس جمع ہوگا جو اسے حسبِ اقتضا تقسیم کرے گا۔ یہ تقسیم ضرورت کے مطابق ہوتی تھی (مثلاً) غیر شادی شدہ کا حصہ ایک ہوتا تھا تو شادی شدہ کے دو حصے۔ اور اگر ساتھ گھوڑا بھی ہو تو اس کا حصہ الگ۔

(۶)۔ پراپرٹی

عصرِ حاضر کے علمائے نفسیات و معاشیات نے پراپرٹی کی دو قسمیں کی ہیں:-

(i) PRIVATE PROPERTY اور (ii) FUNCTIONAL PROPERTY

لفظ پرائیویٹ کا مادہ لاطینی لفظ (PRIVARE) ہے جس کے معنی ہیں۔ "دوسروں کو محروم کر دینا"۔ لہٰذا، پرائیویٹ پراپرٹی سے مراد ایسی پراپرٹی ہے جس سے صرف اس کا مالک نفع اندوز ہو سکے، دوسرے لوگ اس سے محروم رہیں۔ (FUNCTIONAL PROPERTY) کے معنی ہیں اشیائے مستعملہ جسے ہر شخص عندالضرورت استعمال کر سکے۔ قرآنِ کریم پرائیویٹ پراپرٹی کو "استعمالی پراپرٹی" میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی

تکمیل تو نظامِ ربوبیت کی انتہائی شکل میں ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس کی ابتداء عبوری دور میں ہی کر دیتا ہے۔ اس کی بیّن مثال ربوٰا (سودی قرضہ) کو قرضِ حسنہ میں تبدیل کر دینا ہے۔ دولتمند شخص کے پاس جو فالتو روپیہ ہوتا ہے، اُسے وہ اپنی پرائیویٹ پراپرٹی قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس کی تجوریوں میں پڑی رہے تو پڑی رہے، کوئی دوسرا اُسے استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی حاجتمند اُسے استعمال کرنا چاہے تو وہ اس سے اس کے استعمال کی قیمت وصول کرتا ہے۔ اسے ربٰو کہا جاتا ہے۔ عبوری دور میں قرآن اس سے کہتا ہے کہ یہ روپیہ تمہارا ہی سہی، لیکن سرِ دست تمہارے استعمال میں نہیں آرہا۔ تمہارے اس بھائی کو اس کی ضرورت ہے، اسے دے دو تاکہ وہ اسے اپنے استعمال میں لے آئے۔ استعمال میں لانے کے بعد یہ تمہیں تمہارا پورا واپس لوٹا دے گا۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (۲/۲۷۹)۔ تمہارا روپیہ تمہیں واپس مل جائے گا۔ نہ تم پر کوئی زیادتی ہوگی، نہ اس پر۔ وہ اسے قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے کس طرح پرائیویٹ پراپرٹی کو فنکشنل پراپرٹی میں تبدیل کر دیا؟ یہی کیفیت مزارعت کی ہے جس میں زمین (عبوری دور میں) مالک کی رہتی ہے، لیکن کاشتکار اسے استعمال کے لئے لیتا ہے۔ اور استعمال (فصل حاصل کرنے) کے بعد اس کی زمین اُسے واپس لوٹا دیتا ہے۔ یہی صورت مضاربت کی بھی ہے۔ قرآن کریم کا یہ (PROCESS) سارے عبوری دور میں کارفرما رہتا ہے تاآنکہ نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہو جاتا ہے، جس میں "نہ کوئی بندہ رہتا ہے نہ کوئی بندہ نواز"۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی، سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ذرائع پیداوار یا فالتو دولت، پرائیویٹ پراپرٹی رہتے ہی نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم اپنے عبوری دور میں، اتنا ہی نہیں کرتا کہ معاشی قوانین کو بتدریج تکمیل تک لے جاتا ہے۔ وہ اس جماعت کی اس طرح تربیت بھی کئے جاتا ہے جس سے ان کے قلب و دماغ میں اس انداز کا تغیر واقع ہو جائے کہ وہ نظامِ ربوبیت کو اپنے دل کا تقاضا محسوس کریں۔ اس مقام پر پہنچ کر انہیں اس کی بھی ضرورت نہیں رہتی کہ انہیں کوئی حکم خارج سے دیا جائے، تو وہ اس کی تعمیل کریں۔ احکام کی تعمیل کی ایک شکل محکومیت ہوتی ہے جس میں کسی کے حکم کی تعمیل، طوعاً و کرہاً (مرتے بھرتے) کی جاتی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ احکام کی اطاعت تو بطیبِ خاطر ہی کریں لیکن کریں اُس وقت جب کوئی خارجی اتھارٹی اس کا حکم دے۔ اس اطاعت میں آپ اپنے دل میں کسی قسم کی کبیدگی محسوس نہیں کریں گے، کیونکہ انہیں آپ نے، اپنے اوپر خود عائد کردہ فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ احکام کی تعمیل کا آخری درجہ اتباع کا ہے۔ آپ نے گائے کے نوزائیدہ بچھڑے کو دیکھا ہوگا۔ وہ کس طرح اپنی ماں کے پیچھے پیچھے، از خود چلا جاتا ہے۔ اسے ایسا کرنے کے لئے نہ تو کوئی مجبور کرتا ہے اور نہ ہی کوئی خارج سے ایسا حکم دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کے تقاضے سے، اپنی ماں کے پیچھے پیچھے کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔ عرب اسے اتباع کہتے تھے۔ اسی قسم کے لوگ درحقیقت نظامِ خداوندی کو قائم کرنے والوں میں السابقون الاوّلون ہوتے ہیں۔

———— (۰) ————

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ اس نظام میں کتنی چیزیں ایک فرد کی ذاتی ملکیت میں رہ سکیں گی؟..... قرآن کریم نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے، اور اس ایک لفظ کا جواب نہیں۔ اس نے پورے کے پورے نظام ربوبیت کو اس ایک لفظ کے اندر سمٹا کر رکھ دیا ہے ـــــ اور یہی قرآن کا اعجاز ہے۔ اگر اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے کہ الفاظ کے انتخاب میں اس کا کس قدر اعجاز ہے تو قرآنی مفاہیم اور مقاصد کو سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔

عرب اکثر سفر میں رہتے تھے۔ لیکن سفر ایسا جس میں نہ نشانات راہ نہ شاہراہیں۔ نہ راستے میں بستیاں، نہ آبادیاں۔ نہ سرائے، نہ ہوٹل۔ اس لئے ہر مسافر کو لابینفک سامانِ راہ اپنے ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ زمثلاً) ایک لوٹا۔ ایک ڈول۔ رسّی۔ لاٹھی۔ پانی کا مشکیزہ۔ ستوؤں کا تھیلا وغیرہ۔ یہ زادِ راہ ضروری تھا جس کے بغیر سفر نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف، مسافر فالتو اشیا ساتھ رکھتا ہی نہیں تھا۔ (مثلاً) وہ دو لوٹے یا چار ڈول اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ یہ زائد از ضرورت چیزیں اس کے لئے بارِ دوش بن جاتی تھیں۔ وہ راستہ بھر انہیں استعمال کرتا۔ کوئی اور ضرورت مند ہوتا تو اُسے استعمال کے لئے مستعار بھی دے دیتا اور منزل پر پہنچ کر الگ کر دیتا۔ ان اشیائے سفر کو عربوں کے ہاں "متاع" کہا جاتا تھا۔ اب آپ غور کیجئے کہ جب قرآن نے تمام سامانِ زندگی کو متاع کہا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ ـــــ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) "تمہارے لئے اس کرۂ ارض میں کچھ وقت کے لئے رُکنا ہے، اور اس کا سامانِ زیست تمہارے لئے متاع ہے"۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک لفظ کے اندر، قرآن کا پورے کا پورا معاشی نظام کس طرح سمٹ گیا ہے۔ یہ اشیا میسر نہ ہوں تو سفر ہو نہیں سکتا۔ زائد از ضرورت ہوں تو وبالِ دوش بن جاتی ہیں۔

یہ تھا وہ سفرِ حیات جس کے لئے جماعتِ مومنین کو تیار کیا جاتا تھا۔

اب آپ کا وہ سوال سامنے آتا ہے کہ جن اسلامی واجبات کی ادائیگی کے لئے روپیہ درکار ہوگا، اگر کسی کے پاس فاضلہ روپیہ ہی نہ ہوگا تو وہ ان واجبات کو کس طرح ادا کرے گا؟ اس کے لئے آپ نے جو دو تین مثالیں پیش کی ہیں، ان کا حل نہایت آسان ہے۔ مہر تو محض ایک تحفہ ہے جو کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم نے بیوی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہے تو اسے واپس نہ لو، تو اس سے مقصود عربوں کے ایک مذموم معمول کو روکنا تھا۔ وہ لوگ (جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں بھی عام طور پر ہوتا ہے) نکاح کے وقت ڈھیروں مہر دے دیتے تھے اور شادی کے بعد مختلف تراکیب سے اسے واپس لینے کی سوچتے۔ قرآن نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ نہیں کہ اُس نے ڈھیروں مال دینا فرض قرار دیا ہے۔ مہر تو یوں سمجھئے کہ

یک نگاہ، یک خندۂ دزدیدہ، ایک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دِگر!

اس میں کار و بار کا کیا سوال!

پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ نظامِ ربوبیت میں ضروریات پوری کرنے کی شکل جیل خانوں جیسی نہیں ہوگی کہ ڈول میں دال انڈیل دی اور جلی ہوئی چار روٹیاں تھما دیں۔ اس کا نقشہ تو جنتی زندگی کا ہوگا جس میں آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر انواع و اقسام کی نعما حاصل ہوں گی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ سب ایک کو حاصل ہوں گی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ کسی ایک طبقے کو حاصل ہوں اور دوسرا طبقہ ان سے محروم رہے۔ ان نعماء میں سے کوئی اچھا سا تحفہ دے دینا کونسا مشکل ہوگا۔

دوسری شکل آپ نے دیت کی ادائیگی کی بتائی ہے۔ سو اس کا حل تو قرآن نے اس آیت میں بتا دیا ہے جس میں دیت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں کہا ہے کہ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (۴/۹۲)۔ "جس کے پاس اس کی ادائیگی کے لئے روپیہ نہ ہو، وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔" اصل یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے لئے اسلامی نظام، حالات کے مطابق، متبادل قوانین خود تجویز کیا جائیگا۔

حج ۹ھ میں فرض ہوا تھا۔ اور ۱۰ھ کا حج حضورؐ کی سربراہی میں ادا ہوا تھا۔ اس سے پہلے حج کی حیثیت انفرادی تھی۔ مملکتی نظام کے تحت تو یہ فریضہ نبوت کے آخری ایک آدھ سال ہی میں سرانجام پایا ہوگا۔ اس وقت انفرادی تحائف کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہوگی۔ ویسے جہاں تک تحائف (ہدی) کا تعلق ہے، وہ فرائض و واجبات میں داخل نہیں۔ وہ تو دوستوں کے لئے تحائف اور عطیات ہوتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جیسا کہ تاریخ اور روایات سے پتہ چلتا ہے، نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں رسول اللہؐ کے عہد ہمایوں میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل بعد میں خلفاء کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ جنگِ تبوک جو ۹ھ میں ہوئی اور جو حضورؐ کے زمانے کی آخری جنگ تھی، اس میں عسرت کا یہ عالم تھا کہ (قرآن کے الفاظ میں) مجاہدین کے پاس پوری سواریاں بھی نہیں تھیں۔ وہ حضورؐ کے پاس آتے تھے تو آپ بھی بچشم نم معذرت کر کے رہ جاتے تھے۔ ان حالات میں معاشرے میں ضروریاتِ زندگی کی افراط کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کریم حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور تک نازل ہوتا رہا۔ اس لئے اس میں مکمل نظام کی تو حدود کی نشاندہی کی گئی ہے، تفصیلی احکام بیشتر عبوری دور کے ہیں۔ اس نکتہ کے سامنے رکھنے سے بہت سے اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات البتہ واضح ہے کہ اس دور میں پراپرٹی کو پرائیویٹ کی جگہ فنکشنل بنا دینے کی طرف اقدامات کئے گئے تھے۔ اس سے اکثر و بیشتر معاملات حل ہو جاتے تھے۔ خود انفاق کا لفظ بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔ انفاق کے معنی کھلا رکھنا ہے۔ اور پرائیویٹ پراپرٹی کے جو معنی پہلے بیان کئے جا چکے ہیں، ان کی رو سے، اس کے لئے انفاق کی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسا صرف فنکشنل پراپرٹی کی صورت میں ممکن ہے۔ یہ اصولی تبدیلی اُس دور میں، رفتہ رفتہ، ذہن گیر ہو رہی تھی۔

(۰)

باقی رہا اسلامی مملکت میں غیر مسلم رعایا کی پوزیشن۔ سو، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، انہیں شریکِ حکم تو نہیں کیا جا سکے گا۔ جس حکم کی بنیاد مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ پر ہو، اس میں وہ لوگ کیسے شریک کئے جا سکتے ہیں جو سرے سے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کو اتھارٹی ماننے سے انکار کرتے ہوں۔ غیر مسلم تو ایک طرف، یہ نظام تو اُن "مسلمان" نام رکھنے والوں کے ہاتھوں بھی قائم نہیں ہو سکتا جو مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کو آخری اتھارٹی تسلیم نہ کرتے ہوں۔ غیر مسلموں کو اُن کے "مذہب" کی آزادی ہوگی، لیکن انہیں کسی ایسے مسلک کی اجازت نہیں ہوگی جو وجہ تذلیلِ انسانیت، یا باعثِ سلب و نہب ہو۔ اسلامی نظام کے قیام کی وجہِ جواز ہی دنیا سے استبداد و استحصال کا ختم کرنا ہے۔ بنا بریں، خود اس کے اپنے حیطۂ اقتدار میں وہ لوگ کیسے رہ سکتے ہیں جو جور و استبداد کو جائز سمجھتے ہوں۔ ان امور میں ان لوگوں پر (ضروری تبدیلیوں کے ساتھ) اسلامی قوانین بحیثیت قوانینِ مملکت لاگو ہوں گے۔ انہیں ان تمام امور سے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے گا۔ (یہ اسلامی مملکت کے دستور میں شامل ہوں گے)۔ اگر یہ ان شرائط کے مطابق اسلامی مملکت میں رہنا چاہیں تو ہوالمراد ورنہ انہیں اجازت ہوگی کہ وہ کہیں اور چلے جائیں۔

(۰)

آپ نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ مسلمانوں کے جس ملک میں "مذہب" (یعنی مروجہ اسلام) جس قدر زیادہ شدت سے کارفرما ہوگا وہاں اسلامی نظام کا قیام اسی قدر مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ اس نظام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت موجبِ غور و فکر نہیں کہ دنیا میں سیکولر نظام کے تحت تو فلاحی ریاستیں (WELFARE STATES) نظر آتی ہیں، مسلمانوں کے کسی ملک میں ایسی ریاستیں نظر نہیں آتیں۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات بہت دھندلے پڑ گئے ہیں۔ اگر یہاں بے نقاب سیکولرازم نافذ ہوتا تو حالات زیادہ مایوس کن نہ ہوتے لیکن جب سیکولرازم مذہب کا نقاب اوڑھ لے تو اس فریبِ نگاہ (ILLUSION) سے قوم کا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں مجھ سے اکثر احباب کہتے ہیں کہ پھر تم یہاں بیٹھے اپنی عمر، وقت اور توانائی مفت میں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایسے حالات میں دین کے داعی کے لئے "ہجرت" ہی ایک راستہ رہ جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کرۂ ارض نے جو شکل اب اختیار کر رکھی ہے اس میں اس قسم کی "ہجرت" کا بھی امکان نہیں رہا۔ ...... آپ "مذہب" کی تبلیغ کے لئے باہر نکلیں تو دنیا بھر کی مملکتیں آپ کو نہ صرف اجازت دیں گی بلکہ ہر قسم کی سہولتیں بھی بہم پہنچائیں گی لیکن اسلام (الدین) کی تبلیغ کی اجازت، تو دنیا کا کوئی ملک بھی نہیں دے گا ــــــ نہ مسلمان ملک نہ غیر مسلم، خواہ وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو اور خواہ روس یا چین کی سوشلزم ــــــ اور اگر (بفرضِ محال) اس کی کہیں اجازت مل بھی جائے تو اسے ایک تحریک کے طور پر چلانے کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوگی میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان ممالک میں کہیں بھی میسر آ سکیں۔ اندریں حالات اب تو بربیلِ تنزل اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس نظام کے متعلق جو کچھ میں لکھ چلا ہوں (اور وہ کچھ کم نہیں)

اسے (میری زندگی میں یا میرے بعد) ان ممالک میں پھیلا دیا جائے تو اس سے اچھے نتائج مرتب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں اسی مقصد کے پیشِ نظر ابھی تک قلم دوات کو سامنے رکھے چلا جا رہا ہوں۔

لگا چلا ڈھیر راکھ کا میں، بجھا چلا اپنے دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی، یہ آگ اسے کارواں رہیگی

اور اصل تو یہ ہے کہ میں چاہوں بھی، تو قلم دوات کو چھوڑ سکتا ہی نہیں۔ کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ...... جن لوگوں نے اپنے دین کو مذاق سمجھ رکھا ہے اور دنیا کے ہیں یا اقتدار مفادات نے انہیں فریب دے رکھا ہے ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ ..... بات یہیں ختم ہو جاتی تو جیسا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ اسی طرح چھوڑ رہا تھوڑا ہے! وہ آگے بڑھ کر گلے سے پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے: وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ...... (۶) "لیکن اس کے باوجود قرآن کے ذریعے انہیں تباہی سے محفوظ رہنے کی تلقین کئے جاؤ تاکہ کوئی شخص اس لئے ہلاک نہ ہو جائے کہ اس تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ غلط کام کرتا رہا ...... یہ ہے اس کا تقاضا! دنیا کو کیا معلوم کہ ہمارا معاملہ کس سے پڑا ہوا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد[1] (غالب)

اور خدا لگتی پوچھو تو اسے چھوڑ کر جینے کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ پھر عمر تو رہنے کو رہتی ہے، زندگی باقی نہیں رہتی ــــ (کیا آپ نے عمر اور زندگی کے فرق کو اس سے پہلے سمجھا تھا؟ نہیں سمجھا تو اب سمجھ لیجئے کہ

جی لیا چار دن جوانی میں زندگی عمر بھر نہیں ہوتی!

قرآن زندگی کے بغیر جینے والوں کو زندہ نہیں کہتا، مردہ کہتا ہے۔ قرآن چھوڑا تو زندگی گئی! پھر سانس لینے والی لاش بن کر جینے سے کیا حاصل!!)

ــــ (۰) ــــ

میں نے اوپر "مذہب" کے لئے (ILLUSION) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ ہمارے ہاں تو اصطلاحات کو (DEFINE) کرنے کا معمول ہی نہیں۔ یہ اس لئے کہ ایسا کرنے سے فریب دہی یا فریب خوردگی کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن مغربی مفکر بات ہی یہیں سے شروع کرتے ہیں۔ پروفیسر WHITEHEAD سے تو آپ متعارف

---

[1] غالب تو کہتا تھا کہ کھلے بندوں کہہ دو کہ

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

لیکن میں نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ اس قسم کا لائسنس شاعر کو تو حاصل ہوتا ہے اور کسی کو نہیں۔

ہیں۔ وہ دورِ حاضر کا عظیم ترین اور اس کے ساتھ ہی مشکل ترین فلاسفر۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کسی مسئلہ کو (DEFINE) کر دیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جائے گا۔ اس نے حق (TRUTH) کی ... تعریف متعین کی ہے۔ اسے دیکھئے اور جھوم جھوم جائیے — لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بلند حقائق حیثیت تجریدی (ABSTRACT) ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھانے یا عمل میں لانے کے لئے لامحالہ محسوس مظاہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

TRUTH IS THE CONFORMATION OF APPEARANCE TO REALITY

(ADVENTURES OF IDEAS. P. 309)

جب مظاہر حقیقت سے یکسر ہم آہنگ ہوں تو اسے ٹُرتھ (حق) کہتے ہیں۔ اور جب مظاہر حقیقت کا عکس تو نہ ہوں لیکن ایسا بن کر دکھائی دیں تو اسے (ILLUSION) کہتے ہیں جیسے منافق کی مسکراہٹ۔ اس لئے (TRUTH) کا متضاد (ANTINOMY) جھوٹ (FALSEHOOD) نہیں بلکہ (ILLUSION) ہے۔ ..... ہمارے ہاں (ILLUSION) کے لیے کوئی موزوں لفظ نہیں۔

یہ معلوم کر کے آپ متعجب ہوں گے کہ عربی زبان میں باطل کے بھی یہی معنی ہیں۔

ٹرتھ (حق) کی اس تعریف سے دین اور مذہب کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جب مظاہر حقیقت کی صحیح تصویر یا ترجمان ہوں تو اسے دین کہا جائے گا جب وہ حقیقت کے مظہر تو نہ ہوں لیکن حقیقت بن کر دکھائی دیں تو اسے مذہب کہا جائے گا۔ دین (TRUTH) ہے۔ مذہب (ILLUSION) ہے۔ قرآنی حقائق کی طرف دعوت دینے والوں کا کام مذہب کی فریب خوردہ قوم کو (DIS-ILLUSION) کرنا ہوتا ہے۔

———— (۰) ————

اور آخر میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کہ قرآن کے نزدیک مقصود بالذات اعلیٰ و ارفع قوانین عطا کرنا نہیں، مقصود بالذات ان کے ذریعے "انسان کو کچھ اور بنا دینا" ہے۔ میں نے محض سمجھانے کے لئے اسے "انسان کو کچھ اور بنا دینے" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے لئے کوئی متعیّن لفظ ہمارے ہاں موجود نہیں (وضاحت آگے چل کر آئے گی) پہلے اس اجمال کی تفصیل سمجھ لیجئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغربی قومیں اسلحہ سازی کی دوڑ میں پاگل ہو رہی تھیں۔ اس زمانہ میں اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے ایک دفعہ کہا کہ آجکل کی ساری سیاست کا نچوڑ یہ ہے کہ

(ONE WHO HAS STEEL HAS EVERYTHING)

جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے

علامہ اقبالؒ نے یہ سن کر کہا کہ میں اس میں ذرا سی تبدیلی کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

(ONE WHO IS STEEL IS EVERYTHING)

جو خود فولاد ہے وہ سب کچھ ہے

علامہؒ نے ذراسی تبدیلی سے زندگی کا سارا راز منکشف کر دیا۔ ان کا سارا فلسفہ اسی نکتہ کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اس قدر طویل طویل تشریحات کے باوجود وہ کسی ایک لفظ میں یہ نہیں بتا سکے کہ اس (NE/IS) کا مفہوم کیا ہے۔ یعنی انسان کا کیا بننا زندگی کا مقصود ہے۔ ان کے ہاں خودی۔ خودشناسی۔ خودگری۔ خودسازی وغیرہ اصطلاحات بہ کثرت ملتی ہیں لیکن یہ سب بسیط (ABSTRACT) اصطلاحات ہیں۔ ان سے یہ بات نکھر کر سامنے نہیں آتی کہ انسان کا کیا بننا مقصودِ حیات ہے۔ وہ قرآن کے مقصد کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے قرآن تجھے وہ کچھ بنا دیتا ہے۔" لیکن یہ وہ بھی نہ بتا سکے کہ "خدا تجھے کیا بنانا چاہتا ہے۔" اس کے لئے وہ مومن کی اصطلاح ہی سامنے لائے لیکن اس اصطلاح کی حقیقت اس کے (ILLUSIONARY) مفہوم میں پوری طرح چھپ چکی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس اس کا بہترین ماڈل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ غلو پسند اور توہم پرست عقیدتمندوں کی شمعوں کے دھوئیں نے کائنات کے اس حسین ترین موقع کو بھی کجلا کر رکھ دیا ہے[1]

مغربی مفکرین میں سے پہلے برگساں نے اسے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ لیکن وہ بھی (BECOMING) اور (BEING) کے چکر میں کھو کر رہ گیا۔ ہمارے زمانے میں مشہور عالم نفسیات (ERICH FROMM) نے اسے اپنی کاوش کا موضوع بنایا۔ لیکن وہ بھی اس باب میں ناکام رہ گیا۔ اس نے کہا ہے کہ "انسان کا کیا بننا مقصود ہے" اس کے لئے ایک لفظ بطور اسم میں بھی تلاش نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں نے صرف اس کے فعل (VERB) تک اکتفا کیا ہے۔ چنانچہ اس نے اس سوال کے جواب میں کہ مقصدِ حیات کیا ہے اپنی (آخری سے پہلی تصنیف) کا ٹائیٹل یہ رکھا ہے:-

TO HAVE

OR

TO BE

یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا نچوڑ ہے کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ (TO HAVE OR TO BE) اس کے صحیفہ "نظامِ ربوبیت" کا بھی یہی ٹائیٹل سمجھو۔

میں بھی ایک عرصہ سے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کریم کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس موضوع پر اچھا خاصا مواد بھی حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی موزوں لفظ مجھے ابھی تک نہیں مل سکا۔

---

[1] روم کے ایک گرجا میں حضرت مریمؑ کی ایک بے نظیر تصویر ہے۔ اس کے نیچے عقیدت مند اپنی ارادت کی شمعیں جلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان شمعوں کے دھوئیں نے اس تصویر کو چیکٹ بنا دیا ہے۔ غلو پرستوں کی شمعیں ہر بڑی شخصیت کے ساتھ یہی کچھ کرتی ہیں۔

(ERICH FROMM) کا ٹائیٹل موزوں ہے لیکن (TO BE) کا ترجمہ کیا کیا جائے؟ یہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے۔ زبان کی کوتاہ دامنی نہیں، درحقیقت ایک تخلیقی مفکر کی دشواری ہے۔ وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے، اس کے ماحول میں وہ نیا تصور ہوتا ہے۔ (وہ نیا نہ ہو تو اسے تخلیق کہا ہی کس طرح جائے) چونکہ اس ماحول میں وہ تصور نیا ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے پہلے سے کوئی لفظ موجود نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اسے یا تو کوئی نیا لفظ مسکوک (COIN) کرنا پڑتا ہے یا مروّجہ الفاظ کو نئے معنی پہنانے پڑتے ہیں۔ پہلی صورت میں وہ اپنے ہم عصروں کے لئے معمہ بن جاتا، اور اس لئے اسے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہنا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں، اس کے حقیقی مفاہیم (ILLUSION) بن جاتے ہیں۔ اور اس کا زمانہ یا تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، یا اسے پاگل قرار دیتا ہے۔ یہ سب عملی تخلیق کے (LABOURPAINS) ہوتے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ (لم یلد ولم یولد) تو تخلیقِ خداوندی کے لئے ہی مختص ہے۔

بہرحال بات کچھ اور واضح اور الفاظ کچھ اور روشن ہو جائیں تو اس موضوع پر قلم اٹھاؤں۔ ایرک فرام کہتا ہے کہ مقصدِ حیات (TO HAVE) ہے یا (TO BE)؟ لیکن قرآن ہمیں ایرک فرام سے آگے لے جاتا ہے۔ یہ مفکر (TO BE OR TO HAVE) کہتا ہے یعنی یہ یا وہ (دونوں نہیں) اس نظریہ کی رُو سے اگر مقصدِ حیات (TO HAVE) قرار دے لیا جائے تو اس سے انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ اگر مقصد (TO HAVE) کو چھوڑ کر (TO BE) قرار دیا جائے تو یہ بدھ ازم یا عیسائیت کی رہبانیت ہو جائے گی۔ قرآن کی رو سے یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ اس کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ (TO HAVE) بھی ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں بلکہ (TO BE) کا ذریعہ ہونا چاہیئے اس کے نظریہ کی رُو سے (TO HAVE) کی حیثیت "متاع" کی ہونی چاہیئے کہ کوٹا۔ ڈول نہ ہو تو سفر ہی نہ ہو سکے۔ اور اگر لوٹا۔ ڈول لے کر گھر میں بیٹھا رہے تو منزلِ مقصود تک پہنچ نہ سکے۔

———— (٥) ————

اور آخر میں معذرت، ان الفاظ کے ساتھ کہ —— لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم —— ویسے یہ ہماری قدیم روایت بھی چلی آرہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس سوال کا اتنا جواب کافی تھا کہ یہ میرا عصا ہے۔ لیکن حکایت، لذیذ تھی۔ وہ آگے بڑھے۔ کہا کہ یہ میرا عصا ہے۔ میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اپنی بھیڑوں کے لئے اس سے پتے جھاڑتا ہوں۔ ان کے علاوہ اس سے اور بھی بیسیوں کام لیتا ہوں۔ (۲۰/۱۸) وہ تو یوں کہیئے، اللہ میاں نے روک دیا ورنہ معلوم وہ اس داستان کو کس قدر طول دے دیتے؟

لیکن دیکھئے! خدا نے انہیں اس درازیٔ حکایت پر کچھ نہیں کہا۔ اس لئے میں بھی آپ سے ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتا ہوں۔ والسلام

———— (٥) ————

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کیا جنسی تعلق، پرائیویٹ معاملہ ہے؟

طلوعِ اسلام بابت مئی، جون ۱۹۸۲ء میں "عورت" سے متعلق مقالہ کے ضمن میں تحفظِ عصمت کی اہمیت کا سوال سامنے لایا گیا تو ہماری نئی نسل کے ایک نمائندہ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس کی وضاحت چاہی ہے۔ میں نے اسے "نئی نسل کا نمائندہ" اس لئے کہا ہے کہ یہ سوال تنہا اس کی طرف سے نہیں پوچھا گیا۔ مجھ سے اکثر نوجوان اس قسم کے سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔ اس سوال (یا اعتراض) کا ملخص یہ ہے کہ جنسی جذبہ ایک فطری تقاضا ہے۔ اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی، باہمی رضامندی سے اس تقاضا کو پورا کر لیتے ہیں، تو اس میں ہرج کیا ہے؟ یہ ان کا پرائیویٹ معاملہ ہے جس میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سوسائٹی اپنے مصالح کی خاطر (مثلاً اولاد کا تشخص یا کوئی اور قانونی تقاضا پورا کرنے کے لئے) اس پر کوئی شرائط عائد کر دیتی ہے، تو اس طرح یہ معاشرتی مسئلہ ہو جائے گا۔ معاشرہ اس باب میں آزاد ہوگا کہ وہ کوئی پابندی عائد کرے یا نہ کرے۔ اور عائد کرے تو وہ کس قسم کی ہو! (جیسا کہ مغربی ممالک، بالخصوص انگلستان یا امریکہ میں ہو رہا ہے جہاں اب صحبت ہم جنس (HOMO-SEXUALITY) کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا)۔

سوال یہ ہے کہ اگر جنسی اختلاط کا مسئلہ واقعی انفرادی یا زیادہ سے زیادہ، معاشرتی ہے، تو اس کے لئے مرد اور عورت کو باہمی اختلاط کی آزادی ہونی چاہیئے، یا زیادہ سے زیادہ، ان شرائط کے تحت جو معاشرہ نے اس پر عائد کر رکھی ہوں۔ لیکن اگر اس کا اثر پوری قوم۔ بلکہ عالمگیر انسانیت، پر پڑتا ہو، تو پھر اس پر عالمگیر پابندیوں کی ضرورت ہوگی، جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اسے عالمگیر انسانیت، کا مسئلہ قرار دیتا ہے، اس لئے تحفظِ عصمت کو مستقل قدر کہہ کر پکارتا ہے۔ ہمارا یہ نوجوان طبقہ، مذہب سے اس قدر متنفر ہو چکا ہے (جس کے ذمہ دار ہم خود ہیں) کہ وہ کسی مذہبی سند یا دلیل سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ دانشورانِ مغرب کی تحقیق کو سند اور حجت تسلیم کرتا ہے۔ میں نے آج سے قریب تیس سال پہلے، ایک مقالہ لکھا تھا جس میں ایک مغربی دانشور کی تحقیق کی رو سے بتایا تھا کہ جنسی اختلاط کا مسئلہ

انفرادی نہیں۔ اس کا انسانیت کی تہذیب و تمدن، اور قوموں کے عروج و زوال پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی میں اسے وقتاً فوقتاً دھراتا رہا۔ لیکن یہ سوال اب ایسا عام ہو رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بازدگر۔ تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ تیس سال پہلے اگر اس کے اثرات دریا کے ساحلوں تک محدود تھے اور وہ انہی کو متاثر کر سکتے تھے جو ان میں غوطہ زن ہوں، تو آج وہ سیلاب بن کر بستی بستی کوچے کوچے گلی گلی میں پھیل چکا ہے بلکہ گھروں کے اندر تک کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ باہر سے یہ لٹریچر اگر ساون کی گھٹاؤں کی طرح امنڈے چلا آرہا ہے تو ملک کی اپنی زمین سے اس کے چشمے ابلے راہ رو ادب، شاعری، موسیقی، رقص، سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر وغیرہ کی شکل میں قدم قدم پر پھوٹ رہے ہیں۔ اور اس بدنصیب سرزمین کا ذرّہ سا ٹکڑا بھی ایسا نہیں رہا جو کثافت آلودہ نہ ہو چکا ہو۔ کوئی اس کا علاج سنگین ترین سزائیں تجویز کرتا ہے اور کوئی عورتوں کو گھروں کے اندر بند کر دینا۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جو تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھر رہے ہیں، ان کا علاج "دل کے بدلنے" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور دل، صحیح تعلیم و تربیت سے بدل سکتے ہیں۔ خارجی سزاؤں اور بندشوں سے نہیں۔

بہرحال ذیل میں وہ مقالہ درج کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جنسی اختلاط، مرد اور عورت کا ذاتی معاملہ نہیں۔ اس کا اثر قوموں کی زندگی پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔

(۰)

زندگی کے حیوانی تقاضے

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، ایک درجہ اوپر ابھرتی ہے تو اگرچہ اس میں، اس کی سابقہ سطح کے مقابلہ میں، کچھ لطیف اور بلند جوہروں کی نمود ہوتی ہے، لیکن وہ سابقہ سطح کی بہت سی خصوصیات اور لزومات بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ انسانی پیکر میں نمودار ہونے سے پہلے، زندگی عام حیوانی سطح پر کارفرما تھی۔ انسانی سطح پر پہنچ کر وہ حیوانی سطح کی جن خصوصیات کو ساتھ لائی، انہیں حیوانی جبلت یا ANIMAL INSTINCT) کہا جاتا ہے، اور علم الحیات کی رو سے انہیں تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) جذبۂ تغلبِ خویش (SELF-AGGRESSION) اور جذبۂ افزائشِ نسل (SELF-PROCREATION) ان میں تیسرا جذبہ بڑا اہم اور نہایت شدید ہوتا ہے، کیونکہ فطرت کا پروگرام یہ نہیں کہ جو شے موجود ہے وہ ایک مدت تک موجود رہنے کے بعد معدوم ہو جائے۔ وہ چاہتی یہ ہے کہ اس کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے، خواہ اس کے لئے فطرت کو کتنا ہی طویل اور محنت، طلب طریق کار کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ ایک ننھے سے بیج سے پودے کی نمود ہوتی ہے۔ فطرت کس قدر طول طویل پروگرام کے بعد اس پودے کو ایک تناور درخت کا پیکر عطا کرتی ہے۔ فطرت کے نزدیک اس تناور درخت کا منتہیٰ کیا ہے؟ صرف یہ کہ اس میں ایسے بیج پیدا ہوں جن سے درخت کی اس نوع کا سلسلہ آگے بڑھتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ درخت سے

انسان بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے ——— اس کی لکڑی کارآمد ہوتی ہے۔ اس کی سرسبزی اور شادابی کا موسم پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ اس کے پھل ہمارے لئے لذّتِ کام و دہن کا موجب اور جسمانی نشوونما کا باعث بنتے ہیں، لیکن یہ سب وہ لالچ ہیں جو فطرت نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے انسان کو دے رکھے ہیں۔ فطرت کا مقصد درخت سے بیج پیدا کرنا ہی ہے تاکہ اس سے اس کی "افزائشِ نسل" ہو۔ حیوانات میں افزائشِ نسل کا سلسلہ جنسی اختلاط کی رُو سے ہوتا ہے۔ فطرت نے اپنے مقصد (تسلسل و بقائے انواع حیوانی و انسانی) کے حصول کے لئے اس اختلاط میں خاص حظ و کیف کا سامان مضمر رکھا ہے۔ یہ وہ لالچ یا ترغیب ہے جس سے فطرت اپنا کام نکالنا چاہتی ہے۔ زندگی کی بقا، تسلسل اور ارتقاء کے لئے ان جذبات کے تقاضوں کا پورا کرنا ضروری ہے جنہیں ہم نے جبلی تقاضے کہہ کر پکارا ہے ——— کھانا، پینا، صحت کا برقرار رکھنا اور افزائشِ نسل ——— لیکن زندگی کے ان تقاضوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان جبلی جذبات کو بے محابا اور بے لگام نہ چھوڑا جائے، بلکہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ حیوانات کی صورت میں یہ پابندیاں فطرت خود عائد کرتی ہے ——— بکری پر فطرت کی طرف سے عائد کردہ پابندی ہے کہ وہ صرف نباتات کھائے، گوشت نہ کھائے۔ شیر پر یہ پابندی ہے کہ وہ صرف گوشت کھائے۔ چونکہ حیوانات کو صاحبِ اختیار پیدا نہیں کیا گیا اس لئے وہ ان پابندیوں پر عمل پیرا رہنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ انہیں ان کے توڑنے یا ان حدود سے تجاوز کرنے کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔

حیوانات اور جنسی جذبہ

کھانے پینے کے علاوہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے بھی حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ ایک بیل، سال بھر گایوں کے گلے میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔ لیکن اسے کبھی جنسی اختلاط کا خیال تک نہیں آتا۔ حالانکہ یہ قوت اس میں اس وقت بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب اُن کا (MATING SEASON) آتا ہے تو گائے اور بیل دونوں میں یہ جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور جب، ان کے اختلاط سے استقرارِ حمل ہو جاتا ہے تو پھر انہیں اس کا خیال تک نہیں آتا۔ ہر چند یہ بات حیوانی سطح کی ہو رہی ہے، اور وہ بھی جنسی اختلاط کے موضوع پر، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس سلسلہ میں، غالبؔ کا ایک نہایت لطیف و نظیف شعر ابھر ابھر کر جھانکتا اور بے نقاب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

جاک مت کر جیب بے ایامِ گُل   کچھ اُدھر کا بھی تقاضا چاہیئے!

حیوانات اُدھر کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں۔ اشارہ نہیں ہوتا تو ان کا کوئی جذبہ اُبھرتا نہیں۔ اور جب اُدھر کا اشارہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس کی تسکین کے لئے مجبور ہی نہیں، بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یارِ دیگراں کی معذرت کے سامنے کہ

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

انسان اور جنسی جذبہ

لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے ان جذبات کی تسکین کے لئے اس پر فطرت کی طرف سے کنٹرول نہیں کیا گیا۔ کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر انسان پر اس کے جذبات کے تقاضوں کے سلسلہ میں کوئی پابندی عائد نہ کی جائے، انہیں یونہی بےمحابا چھوڑ دیا جائے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے بیان کرنے کے لئے یا سمجھانے کے لئے، اقبالؒ کے ان برجستہ الفاظ سے بہتر اور موزوں تر الفاظ شاید ہی مل سکیں۔ کہ ــــ دیوانہ بکارگہِ شیشہ گراں ـــــ جیسے کوئی پاگل چینی یا شیشے کے برتنوں کی دکان میں گھس آئے۔ اس معاشرہ کی ایسی ہی حالت ہو جائے گی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر یہ پابندیاں آپ عائد کرے گا۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین یا آداب و ضوابطِ معاشرہ، انہی پابندیوں کا نام ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ انسانی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے کا یہ طریق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے جذبات سے الگ ہو نہیں سکتا اس لئے وہ کسی مصلحت یا مجبوری کے تحت جب بھی اپنے جذبات پر آپ پابندیاں عائد کرنے کے لئے بیٹھے گا تو اس کے جذبات اسے ان پابندیوں کو توڑنے یا ان سے نکلنے کی ہزار راہیں سجھا دیں گے۔ چونکہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ موضوع ہے اس لئے میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں اس وقت صرف اتنی وضاحت کروں گا کہ مغربی معاشرہ نے جنسی جذبات کی تسکین کے لئے جو پابندیاں عائد کیں ان کا نتیجہ یا حشر کیا ہوا؟ ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ ابھی کل کی بات ہے۔ اس وقت وہاں کا احساسِ ستر پوشی اس قدر شدید تھا کہ عورتوں کی ٹانگیں تو ایک طرف، جس چیز کے لئے بھی ان کی زبان میں ٹانگ (LEG) کا لفظ بولا جاتا تھا، وہ اسے بھی ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ مثلاً وہ پیانو کی (LEGS) پر کپڑا چڑھا دیا کرتے تھے، کہ اس کی ٹانگیں ننگی نہ ہونے پائیں۔ اس کے بعد، مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر ان کے ہاں جنسیات سے متعلق تصورات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تو اب وہاں کچھ بھی مستور نہ رہا۔ اب وہاں مکمل برہنگی (NUDISM) تہذیب کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے وہاں جنسی اختلاط سے متعلق قانون اور معاشرتی تقاضوں میں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئیں۔ پہلے یہ قدم اٹھا کہ اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی باہمی رضامندی سے، شادی کے بغیر، جنسی اختلاط پیدا کر لیں تو اسے نہ قانونی جرم قرار دیا جائے گا، نہ معاشرہ کی نگاہ میں معیوب۔ البتہ اگر اس اختلاط کے نتیجہ میں کوئی بچہ پیدا ہو جاتا اور وہ لڑکا اس لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرتا، تو اس بچے کو حرامی سمجھا جاتا اور معاشرہ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اب وہاں یہ تمیز بھی اٹھ گئی ہے۔ اب اسے معیوب سمجھا ہی نہیں جاتا۔ کچھ سال ادھر (۱۹۵۶ء میں) ان کے ایک میگزین (ESQUIRE) میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا (A BRIEF FOR BASTARDS) اس میں بڑے فخر سے کہا گیا تھا کہ حرامی بچے بڑے ذہین اور فطین ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں، لکھا گیا تھا کہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے

مشاہیر میں سے بیشتر حرامی تھے۔ جہاں تک شادی شدہ مرد یا عورت کا کسی دوسرے سے جنسی روابط قائم کرنے کا تعلق ہے، وہ اسی صورت میں جرم قرار پاتا ہے جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ہو۔ وہاں کی نئی نسل میں جوں جوں فحاشی کے جراثیم عام ہوتے گئے، جنسی روابط اور اختلاط پر پابندیوں کی رسیاں ڈھیلی پڑتی گئیں حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انگلستان میں مردوں کے باہمی جنسی اختلاط...... (HOMO- SEXUALITY) کو بھی قانوناً جائز تسلیم کر لیا گیا، اور امریکہ میں لڑکوں کی باہمی شادیاں باقاعدہ گرجوں میں جا کر ہونے لگیں۔ کائنات میں یہ "امتیاز" صرف حضرتِ انسان نے اپنے لئے حاصل کیا ہے۔ بدسے بدتر حیوان کے تصور تک میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ...... (۷/۱۷۹) یہ لوگ، انسان نہیں، حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر، تو وہ شاید انہی جیسے "مہذب" انسانوں کے لئے تھا! ان کے ہاں (LOVE) کا لفظ کبھی بڑے مقدس معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اب یہ لپتی کی طرف آتے آتے جنسی بدنہادی (SEX-PERVERSION) کے لئے بولا جانے لگا ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے، انگلستان سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ایک مشہور شخصیت (سابق شاہِ مصر، فاروق مرحوم) کی حرامکاری کی رنگین داستانیں بڑی تفصیل کے ساتھ مزے لے لے کر بیان ہوئی تھیں۔ اس کتاب کا نام رکھا گیا تھا (THE GREATEST LOVER OF THE WORLD) اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ اب وہاں (LOVE) سے کیا مراد ہے... اور (LOVER) کسے کہتے ہیں۔

نئی نسل کی اثرپذیری

یورپ اور امریکہ سے یہی خیالات اب، ہمارے ہاں درآمد ہو رہے ہیں اور ہماری سوختہ بخت قوم کی نئی نسل انہیں بڑے ذوق و شوق سے اپناتی چلی جا رہی ہے۔ ان سے بات کیجئے تو (فکرِ مغرب کے متبع ہیں) جواب ملتا ہے کہ

> جنسی جذبہ کی تسکین کا سوال اگر ایک فرد تک محدود رہے تو کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کا کیا حق حاصل ہے؟ البتہ اگر اس سے کوئی اور فرد بھی وابستہ یا متاثر ہوتا ہو تو یہ مسئلہ معاشرتی بن جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشرہ جس انداز کو بھی روا تسلیم کرے وہ جائز اور درست قرار پا جانا چاہیئے۔ یورپ اور امریکہ، ہم سے زیادہ "مہذب" ہیں اس لئے انہوں نے ان پابندیوں کو قریب قریب آخری حد تک، اٹھا دیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ ابھی قدامت پرست ہے، اس لئے یہ دیگر امور کی طرح اس باب میں بھی ان سے بہت پیچھے ہے۔ رفتہ رفتہ زمانے کے تقاضے انہیں بھی وہاں تک جانے کے لئے مجبور کر دیں گے۔

اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت معاشرتی ضوابط کے تعین یا قوانین سازی کا کام، قدامت پرست طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ طبقہ ختم ہو جائے گا اور یہ امور نئی نسل کے ہاتھ میں آ جائیں گے تو ہمارا ملک

بھی یورپ یا امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کے ہمدوش چلنے کے قابل ہو جائے گا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے ان نوجوانوں کے نزدیک جنسی اختلاط کے نتائج وعواقب کا ایک فرد یا ایک جوڑے تک محدود ہوتے ہیں، اس لئے ان کی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اگر چاہتا تو انہیں اپنے طور پر (یعنی قرآن کریم کی روشنی میں) بتاتا کہ ان کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ جنسی اختلاط، افراد کا پرائیویٹ معاملہ ہے اور کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ ان نوجوانوں کے نزدیک "مذہب پرست" قدامت پسندوں کی کوئی رائے یا مشورہ قابل اعتنا نہیں ہوتا، قابل سند اور اعتبار، مغربی محققین کی تحقیقات اور وہاں کے مفکرین کے فکری نتائج ہوتے ہیں، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس سلسلہ میں، میں اپنے ان عزیزوں کے سامنے، مغرب ہی کے ایک نامور محقق کی تحقیق کے نتائج پیش کروں۔ یہ محقق ہے، کیمبرج یونیورسٹی کا ڈاکٹر (J.D. UNWIN) اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا کہ انسانی زندگی میں جذبات اور کلچر کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان قبائل میں اگر ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا تھا تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعہ اور تحقیق کے نتائج کو اپنی گراں قدر تصنیف میں پیش کر دیا۔ جس کا نام ہے: (SEX AND CULTURE) ذیل میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ انہیں بالخصوص غور سے سنے گا۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ہے:۔

> دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل۔ سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے۔ میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

متن کتاب سے بھی پہلے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام زندگی اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔ (X/V)

اسی کلیہ کو اس نے متن کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

> کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ (صفحہ ۳۲)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جنسی

تعلقات محض ایک جبلی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ہے کہ

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صـ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (صـ۳۴۳)

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اُسے دنیا میں تمدنی عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آ جائے تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا چاہیئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہوں گی، اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

جبری تجرد

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (CELIBACY) کو لیجئے جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

جبری تجرد (COMPULSORY CELIBACY) کے اثرات، انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں۔ (صـ۳۴۴)

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (NUNS) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی وجہ شرفِ انسانیت ہے تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ صـ xii)

---(-)---

تین گروہ

اس تمہید کے بعد آگے چلئے۔ ڈاکٹر انون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، وہ سب سے نچلے درجے کا نام (ZOISTIC) رکھتا ہے۔ اس سے اوپر (MANISTIC) کا درجہ ہے اور سب سے اوپر (DEISTIC) کا درجہ۔ اس کے بعد اسّی (۸۰) قبائل

قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (PRE - NUPTIAL) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھا۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات، پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (CHRSTITY) کا شدت سے تقاضا کرتے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔　　(صفحہ ۳۰ - ۳۲۵)

اس کے بعد ڈاکٹر الون، شادی کے بعد جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ

شادی کے بعد ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔　　(صفحہ ۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو، بجز اس کے کہ عورت، ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔ اس کا نام، اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONOGAMY) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو، بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (MODIFIED MONOGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک مطلق تعدد ازواج (ABSOLUTE POLYGAMY) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کر لے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازواج (MODIFIED POLYGAMY) کہتا ہے۔

ڈاکٹر الون کا کہنا ہے کہ

آج تک کوئی قوم شق ما کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔　　(صفحہ ۳۴۲)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے۔ اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع و فرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِّعمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (صـ ۳۱۲)

اس کے بعد ڈاکٹر انوین نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام و قبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے، ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق نمبر ۲ کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا اصول یہ

بہترین تمدّن کی حامل قوم

تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو لیکن ناقابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے تحت منقطع ہو سکتا ہو۔ یہ وہی شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عائد کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انوین نے، مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کی حدبندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (TENSION) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (COMPRESSION) پیدا ہو جاتا ہے۔
> (صـ ۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے لئے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں لطافت (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انوین کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔
> (صـ ۳۱۷)

فرائڈ کی تحقیق

بہتر ہو کہ اس موقع پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا اور یہ عمارت دن بدن اونچی اٹھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں

جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں، تو) یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں۔ (جسے SUBLIMATION کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فاضل توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

(S. FREUD: INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS; TRANSLATED BY J. RIVIERE: P. 17)

آپ نے دیکھ لیا کہ فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ہیں۔[1]

"ڈاکٹر انون نے بتایا ہے جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس:-

جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کریں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ردمیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (ص ۳۹۸)

جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے، اسے تو میں آگے چل کر بیان کروں گا لیکن اس وقت ایک ایسا نکتہ سامنے آ گیا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا يَزْنُونَ۔ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔

اضمحلال

اس لئے کہ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ...... (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اثاما سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں اثیمۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی قطار کے ساتھ چل سکے، اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دورِ حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی

---

[1] اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرائڈ نے جذبات کے متعلق اپنی تحقیق اور رنگ میں بالعموم جس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ہو رہے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم اس وقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رہے ہیں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ہونے دیا جائے تو یہ اپنا رُخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے فرائڈ بہت جلدی حد تک بعض غلط فہمیوں کا شکار بھی ہوا ہے۔ اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب ...... (ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION) میں بحث کی ہے۔

یہ کہ جنسی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

(۱)

اس کے بعد ڈاکٹر اَن وِن، دورِ حاضرہ کی (نام نہاد) مہذب اقوام کی طرف آتا ہے، اور کہتا ہے کہ انہوں نے بھی جنسی پابندیوں کو اس طرح ڈھیل دینی شروع کر دی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سے جس قسم کی سوسائٹی متشکل ہوتی ہے اس کے متعلق یہ محقق لکھتا ہے کہ

> ہر لڑکی تو از خود حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے اور جس نوجوان سے چاہے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی شرط ہے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی ہوتی ہے نہ لڑکے پر۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں جس میں انہیں لذت ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جونہی جنسی خواہش بیدار ہوئی، اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (صفحہ ۳۴۳)

اس کا نتیجہ

یہی ہیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ان آزادیوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے خود ڈاکٹر اَن وِن کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

> لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم کی زندگی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ہوتی رہے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ جو ذہن ان میں مفاہمت (COMPROMISE) کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ہو، اسے ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ (صفحہ ۴۱۲)

بنا بریں،

کسی سوسائٹی میں تمدنی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم

اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھائی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صـ۲۱۴)

(۰)

قرآنی تعلیم

ڈاکٹر انون کی تحقیق اور اس کے نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد آپ قرآنِ کریم کی طرف آیئے۔ اس ضمن میں، سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم رہبانیت یا خانقاہیت کی تعلیم نہیں دیتا جس میں جنسی جذبات (بلکہ بنیادی زندگی کی ہر کشش اور جاذبیت) کو قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے۔ وہ جبلّی تقاضوں کا پورا کرنا اور دنیاوی جاذبیتوں سے متمتع ہونا، تقاضائے حیات قرار دیتا ہے ان کے لئے البتہ وہ کچھ حدود اور پابندیاں عائد کرتا ہے، اور یہ پابندیاں چونکہ وحی کی رُو سے عائد ہوتی ہیں اس لئے ابدی اور غیر متبدّل ہوتی ہیں۔ یعنی یہ پابندیاں نہ معاشرہ کی وضع کردہ ہوتی ہیں اور نہ ہی معاشرہ یا کوئی نظامِ حکومت ان میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ جب جنسی جذبات کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کیا جائے تو وہ اسے "حفاظتِ فروج" یا (عام الفاظ میں) عصمت، کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عصمت کی حفاظت پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک، جنسی جذبہ کی تسکین کا ایک ہی طریق جائز ہے، اور وہ ہے نکاح۔ لہٰذا، قبل از نکاح جنسی اختلاط، یا نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے یا مرد کا کسی دوسری عورت سے جنسی اختلاط (خواہ وہ ان کی باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے اور زنا سنگین جرم۔ نکاح کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ہنگامی اور وقتی جنسی اختلاط کے لئے باہمی رضامندی کا نام نہیں۔ یہ عاقل، بالغ، لڑکے اور لڑکی کا باہمی معاہدہ ہوتا ہے، اس امر کا کہ ہم ان حدود و قیود اور فرائض و حقوق کے مطابق، جنہیں قرآن نے عائد کیا ہے، میاں بیوی کی حیثیت سے باہمی رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ لہٰذا، اس میں وقتی جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس نے نکاح کو مِيثَاقًا غَلِيظًا ...... (۲۱/۴) پختہ عہد کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا کہ جب جی چاہا یہ کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اُکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور پھر ایک نیا گھر بنا لیا۔ اس نے وحدتِ زوج (MONOGAMY) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے، اور تعددِ ازدواج کو محض ایک ہنگامی معاشرتی مشکل کے حل کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط") اس معاہدہ کو عند الضرورت فسخ کرنے کے لئے، جسے طلاق کہا جاتا ہے اس نے احکام و ضوابط مقرر کئے ہیں۔ یہ نہیں کہ جب جی چاہا، اسے، ایک۔ دو۔ تین کہہ کر توڑ دیا اور دوسری بیوی گھر لے آئے۔

(۰)

عصمت کی تاکید

ہمارے ہاں عام طور پر عصمت کا لفظ لڑکیوں یا عورتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ لڑکوں یا مردوں کے لئے نہیں، اور با عصمت ہونا لڑکیوں کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ لڑکوں کے لئے نہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے حفاظتِ عصمت، لڑکوں اور لڑکیوں، مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی دونوں کے لئے ایک جیسا جرم، اور اس کی ایک جیسی سزا۔ اس نے جہاں جہاں حفاظتِ عصمت کا حکم دیا ہے وہاں، مردوں کو پہلے مخاطب کیا ہے، عورتوں کو بعد میں۔ اس میں بھی ایک نکتہ پنہاں ہے۔ اگر معاشرہ میں مرد با عصمت ہو جائیں تو عورتیں خود بخود با عصمت ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے مومنین کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (۲۳/۵) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں (دیگر امور کی احتیاط اور) ان خصوصیات کے حامل مومن کامیاب ہوں گے (قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ - ۲۳/۱)۔ ان خصوصیات کے حامل مومن کامیاب ہوں گے۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، قوموں کی کامیابی اور ناکامی، ان کے عروج و زوال، ان کی موت و حیات کا دارومدار جن اسباب و عوامل پر ہے، ان میں حفاظتِ عصمت کو بڑا دخل ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس تک ڈاکٹر انوان اپنی مدت العمر کے تجارب و تحقیقات کے بعد پہنچا ہے۔ دیکھئے! وہ کیسے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

> انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت، مطلق و صورت زوج کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخِ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی آشنا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی) اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا، وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (ص ۳۴۲)

میں اتنا اور عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم نے انسان کے جبلی جذبات کی تسکین پر جو پابندیاں عائد کی ہیں تو ان کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ اس سے اس معاشرہ یا قوم کو کامیابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

ان سے فردِ متعلقہ کی ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ (اسے آخروی زندگی کی خوشگواریاں یا جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے) چونکہ اس خطاب میں میرا موضوع یہ ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کی موت و حیات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے میں نے اس گفتگو کو قومی عروج و زوال تک محدود رکھا ہے۔ اس سے فرد کی ذات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے اور جداگانہ بحث کا متقاضی۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے۔

ضبطِ نفس

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جنسی جذبات کی تسکین کا ایک ہی طریق جائز اور صحیح ہے اور وہ ہے عقدِ نکاح۔ سوال یہ ہے کہ اگر نکاح کے مواقع میسّر نہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا...... (۲۴/۳۳)" جن لوگوں کو نکاح کے مواقع میسّر نہ ہوں، وہ ضبطِ نفس (SELF – CONTROL) سے کام لیں"۔ اور یہی ہے اس موضوع کا نکتۂ ماسکہ۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک نوجوان (لڑکا یا لڑکی) بلوغت کی عمر تک پہنچ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے لئے ضبطِ نفس ممکن ہے؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھانے، پینے کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک طبیعی تقاضا ہے، اور دیگر طبیعی تقاضوں کی طرح اس کا پورا کرنا بھی ضروری — لہٰذا، ضبطِ نفس ایک غیر طبیعی یا غیر فطری تقاضا ہے — اور یہی وہ بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (NATURAL INSTINCT) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرّہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے۔ شروع میں آپ کو اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی پی لیتے ہیں تو فبہا، ورنہ اس کی شدّت بڑھتی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی ہے۔ اس سے ہم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) قرآنِ کریم میں ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ ہم اس کا خیال

نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لئے حرام کو حلال قرار نہیں دیا، بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ (۲۴/۳۳) اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جنسی ..... تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہے اور ان پر کنٹرول رکھنا انسان کے لئے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کو طبعیہ آوارہ نہ بنائے اور

خیال کا دخل

ضبطِ نفس

اس طرف توجہ منعطف نہ کرے تو جنسی جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ خیال کہ اس جذبہ کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے اعصابی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو یہ بھی غلط ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سائیکالوجی کی تحقیقات اس سے مختلف نتیجہ پر پہنچاتی ہیں۔ ان تحقیقات کی رو سے، نہ صرف یہ کہ اس جذبہ پر کنٹرول رکھنے سے کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا، بلکہ اس سے انسان کی تخلیقی صلاحیتیں (CREATIVE POTENTIALITIES) اس قدر تقویت حاصل کر لیتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جو لوگ پاکیزگیٔ قلب و نگاہ کی زندگی بطیبِ خاطر بسر کرتے ہیں ان کی انسانی صلاحیتیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ اعصابی عوارض اس وقت لاحق ہوتے ہیں جب انسان اپنے جنسی جذبات کو اکساتا اور ان میں ہیجان برپا کرتا رہے اور پھر ان کی تسکین کا فطری طریق اختیار نہ کرے۔ اگر انہیں بیدار ہی نہ کیا جائے تو پھر کسی قسم کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا، بلکہ انسان کی فکر و عمل کی صلاحیتیں نت نئی توانائیاں حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔

———(-)———

تشیعِ فواحش

بات یہاں تک پہنچی ہے کہ حفاظتِ عصمت کے لئے ضبطِ نفس ضروری ہے اور ضبطِ نفس اسی صورت میں ممکن ہے کہ جنسی جذبات کو بیدار نہ ہونے دیا جائے۔ ان میں ہیجان برپا نہ ہونے دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس کے لئے کیا طریق تجویز کرتا ہے ——— وہ، عام محاورہ کے مطابق چور کی چور کی ماں کو مارتا ہے کہ وہ چور کو جنم ہی نہ دے۔ اس کے لئے وہ دو بنیادی طریق تجویز کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ معاشرہ کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ ان تمام دروازوں کو بند کر دے جن سے وہ اسباب، وہ عناصر داخل ہوتے ہیں جو جنسی خیالات کے ابھارنے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ اسباب و عناصر کو فحشاء یا فواحش کہہ کر پکارتا ہے۔ انہیں آپ "مشتہیات" کہہ لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ .... (۷/۳۳) اے رسول! اعلان کردو کہ میرے رب نے فواحش کو حرام

قرار دے دیا ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ "ظاہری فواحش" کے معنی تو واضح ہیں۔ یعنی شہوانیات کی محسوس و مرئی شکلیں۔ لیکن باطنی فواحش سے مراد وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں، جن کا اثر انسان کے خیالات پر پڑتا ہو اور اس طرح وہ جنسی جذبات میں ہیجان برپا کرنے کا موجب بنتے ہوں۔ قرآن نے انہیں بھی اسی طرح حرام قرار دیا ہے جس طرح (مثلاً) زنا کو حرام قرار دیا ہے۔ اس نے زنا کو بھی فاحشہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۱۷/۳۲) وہ معاشرہ میں فواحش پھیلانے والوں کو سنگین ترین جرم کا مرتکب اور شدید ترین سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے، جب کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۴/۱۹) "جو لوگ اسلامی معاشرہ میں فواحش پھیلانا پسند کرتے ہیں اور اس میں لذت لیتے ہیں وہ اس زندگی میں بھی شدید عذاب کے مستحق ہیں اور آخروی زندگی میں بھی۔ فواحش پھیلانا، تمہاری نگاہوں میں کچھ ایسا سنگین جرم نہ ہو لیکن خدا اس سے خوب واقف ہے کہ اس کے نتائج کس قدر مضرت رساں ہوتے ہیں۔" معاشرہ میں عملی بے حیائیوں کا موجب وہی خیالات بنتے ہیں جو ان فواحش کے عام ہونے سے سینوں میں ابھرتے ہیں۔ مومن ان شہوانیات سے ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔ (۴۲/۳۷)۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ان کے قریب تک نہ جاؤ۔ ان سے اس طرح دور دور رہو جس طرح انسان متعدی امراض سے دور رہتا ہے کہ ان کے قریب جانے سے (INFECTION) کا خطرہ ہوتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) جنسی جذبہ خیالات سے برانگیختہ ہوتا ہے۔

(۲) قرآنِ کریم ہر اس چیز کے عام کرنے کو جرم قرار دیتا ہے جو ان خیالات کی انگیخت کا موجب بنے۔ ان چیزوں کو وہ فواحش کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں فواحش

یہ ظاہر ہے کہ ہمارے موجودہ معاشرہ میں فواحش کی اشاعت ایک وبائی شکل اختیار کر چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے! دنیا میں یہ انداز شروع سے چلا آرہا ہے کہ بڑے بوڑھے، تمام خرابیوں کی ذمہ دار نئی نسل کو ٹھہراتے ہیں اور اس طرح خود فریبی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی روشِ کہن کے مطابق، سال خوردہ طبقہ اٹھتے بیٹھتے، نوجوان نسل کو کوستا، اور انہیں تمام اخلاقی خرابیوں اور بے حیائیوں کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے، جب ہیضہ وبائی شکل اختیار کر جائے تو ہم ہیضہ کے مریضوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ تم اس مرض میں مبتلا کیوں ہو گئے ہو، حالانکہ اس سب و شتم کے سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ہیضہ کے جراثیم کی روک تھام کا انتظام نہ کیا اور اس طرح وہ بے محابا پھیل کر متعدی شکل اختیار کر گئے۔ سوال یہ ہے کہ فواحش کے جراثیم

اس وقت ہمارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں، انہوں نے کب سے پھیلنا شروع کیا اور اس کے ذمہ دار کون تھے! یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ضخیم مجلدات درکار ہوں گی۔ میں اس وقت صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد شعر و ادب کے نام سے جو لٹریچر تخلیق ہوا، اس کا بیشتر حصہ فواحشات پر مبنی تھا اور وہ بھی بڑی ہی پست سطح کی فواحشات پر۔ قوموں کا دورِ انحطاط، شہوانیات کے لئے بڑا ساز گار ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے حیات بخش برگ و ساز سے حاصل کردہ حقیقی سرور و انبساط سے محروم ہو جائے تو وہ ذہنی عیش سامانیوں کی بھنگ، اور تخیلاتی لذت اندوزیوں کی افیون پہ اتر آتی ہے۔ ہمارے دورِ انحطاط میں یہ بھنگ اور افیون عام ہو رہی تھی، اس لئے اس دور کا پیدا کردہ شعر و ادب، اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہماری شاعری

آپ سو، دو سو سال پہلے کی بات چھوڑ دیئے۔ داغؔ کا انتقال تو ابھی کل ہوا ہے۔ اس کے ہاں (اور ان جیسوں کے ہاں) جس قدر عریانی اور فحاشی ہے۔ وہ اس قدر حیا سوز ہے کہ کسی شریف محفل میں اس کی مثالیں بھی پیش نہیں کی جا سکتیں۔ میرے لئے ایسا کرنا اور بھی مشکل ہے کیونکہ قارئین میں میری بیٹیاں اور بہنیں بھی ہیں۔ بطور نمونہ آپ اس کا صرف، ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

مل جائے پہلے مجھ کو، پھر اس کے بعد اُبھرے
وہ چیز جو اُبھر کر، کرتے ہیں جھول ڈالے!

ہماری شاعری میں غزل، سب سے زیادہ پُر کشش صنفِ سخن ہے۔ غزل کے اقنومِ ثلاثہ کیا ہیں؟ عاشق (یعنی خود جنابِ شاعر)، معشوق یا محبوب۔ اور ایک رقیب، جو رُو سیاہ ہوتا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جسے محبوبہ یا معشوقہ کہا جاتا ہے وہ اپنی بیوی تو ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا، وہ، کسی کی بہو، بیٹی یا بہن ہوگی۔ اس محبوبہ کو عام طور پر دو لباسوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایک، بازاری عورت کے روپ میں، جس کے سینکڑوں چاہنے والے ہوتے ہیں۔ وہ رات کے وقت مئے پیئے، ساتھ رقیب کو لئے پھرتی رہتی ہے۔ شروع میں تو اسے صرف اپنے لئے مخصوص کر لینے کا داعیہ ہوتا ہے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ جذبات ماند پڑھ جاتے ہیں یا (غالب کے الفاظ میں) قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، تو مفاہمت کی اس صورت کو غنیمت سمجھا جاتا ہے کہ

تم جاہو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس کا دوسرا روپ، ایک ناکتخدا، شریف، پردہ نشین جوان لڑکی کا ہوتا ہے جسے ملنے کے راستے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان کے سامنے معاشقہ کی داستانیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق ہمارے زمانے کے ایک جواں مرگ شاعر نے خدا سے کہا تھا کہ میرے اس دفترِ عمل کو سرِ حشر نہ کھولنا، کیونکہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

رندِ مشرب شعراء کو چھوڑیئے، حسرت موہانی جیسا پاک باز، متقی، پرہیزگار، اپنے اس قسم کے معاشقہ کی داستان، اپنی اُس غزلِ مسلسل میں، محاکاتی انداز میں بیان کرتا ہے جو بڑی مشہور ہے۔ چند شعر آپ بھی سنیئے ؎

چپکے چپکے رات دن، آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے!

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اُسی جانب نگاہِ شوق کا!
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں انگلی کا دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونہ دفعتہً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سونا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے، راتوں کو آنا یاد ہے!

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے!

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

اور مقطع سنیئے کہ

باوجود ادعائے اِتقا حسرت مجھے!!
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

جب حسرت جیسا مدعیٔ زہد و اتقاء، اپنے عہدِ ہوس کے افسانوں کو بایں نمط بیان کرتا ہے تو رندانِ شاہد باز کا کیا ٹھکانہ؟ عشق و محبت کی ان داستانوں میں، ملاقات کے لئے ہمیشہ رات کا وقت رکھا جاتا ہے۔ شبِ وصال اس کی انتہائی منزل ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ جس جس انداز سے کھینچا جاتا ہے، اس سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اس رات شاعر کچھ اس قسم کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں، خدا جانے
بچھاؤں پھول یا کلیاں بچھاؤں بستر پر

غالب جیسا فکرِ بلند کا حامل شاعر بھی، پری پیکرانِ بنارس کو "بہار بستر و نوروزِ آغوش" کہہ کر پکارتا ہے۔ بات آگے بڑھتی ہے تو کہتا ہے کہ

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا!
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور تو اور، ریاض خیر آبادی جیسا خضر صورت، تہجد گذار بھی ان راتوں کا ماجرا کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ

شبِ وصل چھیڑا تو جھنجھلا کے بولے
یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟

وہ "یہ کیا کر رہے ہو" کو بلا تفصیل نہیں چھوڑتا۔ بلا حجاب کہتا ہے کہ

یار کے بند قبا آہستہ وا کرنے کو تھے!!
چوری چوری کچھ نہ پوچھو رات کیا کرنے کو تھے

ریاض تو "بندِ قبا وا کرنے" پر اکتفا کرتا ہے، نظیر اکبر آبادی لگی لپٹی رکھے بغیر بہت دُور آگے تک پہنچ جاتا ہے لیکن میں اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ حیا بڑی سختی سے عناں گیر ہو جاتی ہے۔

مجھے ندامت ہے عزیزانِ من! کہ مجھے سر محفل اس قسم کے اشعار پیش کرنے پڑ رہے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ــــ بنتی نہیں ہے مینا و ساغر کہے بغیر۔

جب وہ محبوب غیر کے ہاں کی شب بسری کے بعد واپس آتا ہے تو وہ ماجرائے شب کے متعلق غلط بیانی سے کام لینا چاہتا ہے لیکن اُسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ اس انکار و اخفار سے کیا حاصل؟ ؎

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

یہاں تک ہی نہیں۔ اس سے دوٹوک الفاظ میں پوچھا جاتا ہے کہ

کس کے آغوش نے کھینچا ہے تجھے تنگ آج — تیری تصویر سے ملتی نہیں صورت تیری

اُس پر ندامت طاری ہو جاتی ہے تو کہا جاتا ہے، خیر کوئی بات نہیں ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے — پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

وہ اگر پردہ نشین ہے اور لپٹی لپٹائی گھر سے نکلتی ہے تو پیچھے سے آواز دی جاتی ہے کہ

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

ہم انگلستان کے اس قانون کو بڑی حیرت اور انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کی رُو سے انہوں نے اختلاطِ ہم جنسی (HOMO-SEXUALITY) کو قانوناً جائز قرار دے دیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ روش بڑی قدیم ہے اور اسے بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے۔ اُردو شاعری کی ندی کا سرچشمہ فارسی شاعری ہے اور فارسی شاعری کی ساری عمارت امرد پرستی پر استوار ہوتی ہے۔ وہاں محبوب ہوتے ہی "مُغ بچے" ہیں۔ وہاں سے یہ جراثیم ہماری شاعری میں بھی در آئے...... چنانچہ میر تقی جیسا صاحبِ سوز و گداز، اُس "عطار کے لونڈے" سے دوا لیتا ہے جس نے اسے بیمار کر رکھا ہے۔ غالب کے ہاں، اس باب میں عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے اپنے ہاں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی فحاشیات کا یونہی سرسری سا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی اشارات و کنایات میں۔ اگر میں اس کی دیگر اصناف (افسانے، ڈرامے وغیرہ) کا بھی ذکر کرتا، تو ہماری اس شستہ و شائستہ محفل کی فضا تعفن سے بھر جاتی۔ بہرحال، یہ ہے ہمارا وہ ادبی ترکہ اور سرمایہ جسے ہم نے اپنی نئی نسل کو دیا ہے۔

اقبالؒ نے ہماری اس شاعری کے انداز کو بدلا اور سنجیدہ طبائع کو قدرے اطمینان ہوا کہ نشرِ فحاشی کا یہ دروازہ (یعنی ہیجان خیز شاعری) بالکل بند نہیں ہوا، تو کم از کم نیم وا تو ہوا ہے، لیکن ہماری بدقسمتی سے، ان کی جگہ ان ذرائع ابلاغ اور اسبابِ نشر و اشاعت نے لے لی جن کے راستے فحاشی سیلاب کی طرح امنڈ کر آ گئی ——— یعنی سینما۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن وغیرہ۔

قرآن کریم نے کسی دور کے شر کو مُسْتَطِيْرًا کہہ کر پکارا ہے۔ (۷۶/۷) یعنی وہ شر جو اڑ کر دوسروں تک پہنچ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے شاید ہمارے ہی دور کا شر مراد ہے کہ اس سے آپ کتنا ہی بچنا چاہیں، یہ آپ تک اڑ کر پہنچ جاتا ہے۔ آپ سوچیے کہ ہماری نئی نسل کے نوجوان جو اس فضا میں پرورش پائیں، وہ فحاشیات کے ان جراثیم سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ یوں تو ہمارا سارا ہی قدامت پرست طبقہ ان نوجوانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے، لیکن مذہب پرست طبقہ ان بیچاروں کو جینے ہی نہیں دیتا۔ وہ معاشرہ کی ساری بدنہادی اور بے راہ روی کا ذمہ دار انہی کو ٹھہراتا ہے۔ اور اٹھتے بیٹھتے کہتا رہتا ہے کہ مغرب کی تعلیم نے انہیں تباہ کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے غلط نظام و نصابِ تعلیم کا اس میں بڑا حصہ ہے لیکن ہمارے

دارالعلوموں کی تعلیم

مکتبوں اور دارالعلوموں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس میں جنسی جذبات کی برانگیختگی کا جس قدر سامان ہوتا ہے، اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آپ فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھئے، اس میں زن و مرد کے تعلقات کے سلسلہ میں جو مسائل ملیں گے، ان کی عریانیت ناقابلِ برداشت ہو گی۔ میں نے اپنے ہاں کی شاعری کی تو بعض مثالیں، بصد معذرت پیش کر دی ہیں، کتبِ فقہ کے ان مسائل کا اشارۃً اور کنایۃً ذکر کرنا بھی

۱؎ میرا مطلب یہ نہیں کہ شعر و ادب کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو دھو، نچوڑ کر انہیں وعظ بنا دیا جائے اور شعر کچھ اس قسم کے کہے جانے لگیں کہ

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور گر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے کو تو اس کے برا مانتا ہے!

میرا مطلب یہ ہے کہ شعر و ادب کو عریانیت، اور فحاشیت سے پاک اور صاف کر کے، اسے ایسے حسین اور وقیع انداز میں پیش کیا جائے جس سے تولیدی (جنسی) جذبات میں ہیجان خیزی کے بجائے تخلیقی صلاحیتوں کی نمود ہو۔ اقبالؒ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

میرے لئے ممکن نہیں۔ آپ زیادہ نہیں تو کم از کم ہدایہ یا دُرِّ مختار میں باب الغسل یا باب الصوم کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں "مسائل" کے نام سے کیا کچھ لکھا ملتا ہے۔ اور وہ نوجوان طالب علموں کے جنسی جذبات میں (جو بالعموم غیر شادی شدہ ہوتے ہیں) کس قدر ہیجان برپا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

فقہ سے آگے بڑھ کر قرآن و حدیث کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں ان دارالعلوموں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت ہے: نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)
اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "تمہاری بیویاں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جس طرح جی چاہے جاؤ۔"[1] صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "بعض آدمی عورتوں سے اغلام کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔" اس سے یہ بحث چل پڑی کہ بیوی کے ساتھ وطی فی الدبر (مقعد میں جماع) جائز ہے یا نہیں۔ علامہ بدر الدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے بخاری کی شرحیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بخاری کی اس تفسیر پر بڑی تفصیل بحث کی ہے۔ اور اس باب میں مختلف ائمہ کے اقوال اور مسالک بیان کئے ہیں۔ مثال کے طور پر امام مالکؒ کے متعلق علامہ عینی نے لکھا ہے:۔

> محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے میں امام مالکؒ بن انس کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آ رہا ہوں۔ ایسے ہی ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے تھے کہ میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں پایا جس کی دین کے بارے میں پیروی اور اقتدا کروں اور وہ اس کے حلال ہونے کے بارے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت کے ساتھ دُبر میں جماع کرنے کے بارے میں۔

یہ ہے ایک مثال قرآنی آیات کی اس تفسیر کی جو احادیث کی رُو سے ہمارے دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب ان درسگاہوں کے نوجوانوں میں ایسی تفسیروں پر بحثیں ہوتی ہوں گی تو ان سے ان کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہو گی؟ ایسی روایات پر بحثیں جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ

> رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ حضرت سلیمانؑ کی سو (یا نناوے) بیویاں تھیں۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ آج رات کو میں ان عورتوں کے پاس جاؤں گا اور وہ سب ایک ایک شاہ سوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کریں گے۔ ان کے ہم نشین نے کہا کہ انشاء اللہ کہو۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کہا تو ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی سو وہ بھی آدھا بچہ جنی

---

[1] اس آیت کا صحیح مفہوم، مطالب الفرقان جلد سوم میں دیکھئے۔

قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو (سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور) بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔
(بخاری - کتاب الجہاد)

مرحوم مودودی صاحب کی تعلیم

یہ ہماری قدامت پرست درسگاہوں میں دی جانے والی تعلیم کی چند ایک مثالیں ہیں۔ ہمارے کالجوں کے طلبا کا ایک کثیر طبقہ جماعت اسلامی کے زیر اثر ہے۔ آپ دیکھئے کہ ان کے ہاں جنسیات کے سلسلہ میں کس..... قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مرحوم مودودی صاحب بڑی شدومد سے اس کا پرچار کرتے تھے کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:-

حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں کے ساتھ کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم القرآن - جلد اوّل - پہلا ایڈیشن - صفحہ ۳۴۰)

اس بحث کو انہوں نے اپنی کتاب، تفہیمات حصہ دوم میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے:۔

(۱) لونڈیوں سے بلا نکاح جنسی اختلاط کیا جا سکتا ہے۔

(۲) لونڈیوں کی تعداد پر کوئی قید نہیں۔

(۳) ان کے مالک جب چاہیں انہیں دوسروں کی طرف منتقل بھی کر سکتے ہیں اور فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ (تفہیمات - حصہ دوم - صفحہ ۳۲۳-۲۹۰)

(ضمناً) آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان کی مجلس دستور ساز کے ۱۹۷۳ء کے موسم بہار کے سیشن میں، جمعیت العلماء اسلام کے رکن اسمبلی، مولانا نعمت اللہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ

غلامی کو منسوخ کرنا خلاف اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔
(بحوالہ پاکستان ٹائمز - یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

ہاں، تو بات یہ ہو رہی تھی کہ مرحوم مودودی صاحب کے ہاں سے نوجوانوں کو کس قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ اگر ایک نوجوان کی شادی کا انتظام نہ ہو سکتا ہو۔ اس کا شباب عروج

؎ تفصیلی بحث آپ کو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں" میں ملے گی۔

پر ہو تو کیا وہ زنا سے بچنے کے لئے " اپنے ہاتھ سے کام لے سکتا ہے " قبل اس کے کہ ہم مودودی مرحوم کا جواب آپ کے سامنے لائیں ، آپ کو یاد دلا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس سوال کا جواب پہلے ہی سے موجود ہے ۔ اور وہ یہ کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا ..... (۲۴/۳۳) " جو لوگ نکاح کی صورت نہ پاسکیں وہ ضبطِ نفس سے کام لیں " اس سوال کے جواب میں مرحوم مودودی صاحب نے لمبی چوڑی بحث کے بعد لکھا ہے کہ

ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل (یعنی MASTERBATION) مرتب) حرام ہے ۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور عمل لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے ۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق میں کہا جا سکتا ہے کہ " شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے " ۔

(رسائل و مسائل ۔ جلد دوم ۔ ص ۲۰۲)

یعنی یہ فعل تو حرام ہے لیکن عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ ....

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ سوال اُبھرتا ہوگا کہ مودودی مرحوم نے سورۂ نور کی اس آیت کے متعلق بھی کچھ کہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت کے لئے صرف ایک ہی صورت بتائی ہے اور وہ یہ کہ ضبطِ نفس سے کام لے ۔ مرحوم نے اس آیت کو لکھا تو ہے لیکن اس کے ترجمہ میں اپنے مطلب کے لئے گنجائش نکال لی ہے ۔ انہوں نے آیت مع ترجمہ اس طرح لکھی ہے ۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ .... (النور ۔ ۴)

اور چاہیئے کہ وہ لوگ باعفت رہنے کی کوشش کریں جو نکاح کا موقعہ نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے ۔ (ایضاً)

شاہ رفیع الدینؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں " اور چاہیئے کہ پاکدامنی کریں وہ لوگ کہ نہیں مقدور پاتے نکاح کا " مولانا محمود الحسنؒ کا ترجمہ یہ ہے ۔ " اور اپنے آپ کو تھامتے ہیں جن کو نہیں ملتا سامان نکاح کا " یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ پاک دامن رہیں ۔ اپنے آپ کو تھامے رہیں ۔ ضبطِ نفس سے کام لیں اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ باعفت رہنے کی کوشش کریں ۔ یعنی وہ باعفت رہنے کی کوشش کریں .... اس میں کامیاب ہو جائیں تو فبہا ورنہ اس عمل کو اختیار کر لیں جسے خود مودودی صاحب کے الفاظ میں خدا نے حرام قرار دیا ہے ۔

یہ تو اس صورت میں ہوا جب اس نوجوان کو کوئی عورت نہ مل سکے ۔ لیکن اگر عورت میسر آ سکے مگر اس سے " شرعی نکاح " کی صورت ممکن نہ ہو ، تو پھر کیا کیا جائے ! پھر عارضی نکاح کر لیا جائے جسے متعہ کہتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :-

> فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر بھی مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں، یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

یعنی مودودی مرحوم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ جنسی جذبہ پر کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے۔ شہوت رانی کے لئے وہ کبھی استمناء بالید (MASTERBATION) جیسے فعل حرام کی گنجائش پیدا کر لیتے ہیں اور کبھی متعہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق کہا تھا کہ اضطراری حالت میں حرام چیز کے کھانے کی اجازت ہے۔ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اس نے کہیں ایسا نہیں کہا ـــــ لیکن مودودی صاحب اضطراری حالتوں میں اس جذبہ کی تسکین کی صورتیں تجویز فرما رہے ہیں اور انہیں جائز قرار دے رہے ہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کو اس کا علم نہیں تھا کہ جنسی جذبہ کی صورت میں اضطراری کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس نے اس کے مداوا کی کوئی شکل نہ بتائی۔ یہ کمی مودودی صاحب نے پوری کر دی۔ (معاذ اللہ)۔

اور آگے بڑھیئے

یہ ہے وہ تعلیم جو ہمارے نوجوانوں کو دی جاتی ہے جو کالجوں کی جراثیم آلودہ فضا سے بچنے کے لئے مذہب کی مقدس اور پاکیزہ آماجگاہ میں پناہ لینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن مودودی مرحوم اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ جنسیات کے سلسلہ میں وہ ان نوجوانوں کو اور بھی بہت کچھ بتاتے ہیں (مثلاً) ایک مرد، بیک وقت چار عورتوں سے شادیاں بلا محابا کر سکتا ہے۔ پھر ان میں سے جسے جس وقت جی چاہے ایک، دو، تین کہہ کر طلاق دے سکتا اور اس کی جگہ کوئی دوسری عورت حبالۂ نکاح میں لا سکتا ہے (THE MAKING OF HUMANITY) کے مشہور مصنف، رابرٹ بریفا نے عورتوں کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے (THE MOTHER) اس میں وہ ایک کرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر، بیک وقت ایک ہی عورت سے شادی کی۔ لیکن وہ قریب چالیس عورتیں بدل چکا تھا۔ ہمارے ارباب شریعت کے نزدیک اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا[1]۔ مودودی مرحوم نے عائلی قوانین کی جو اس قدر مخالفت کی تھی تو وہ اسی بنا پر تھی کہ حکومت جنسی آزادی پر اس قسم کی پابندیاں کس طرح عائد

---

[1] نکاح، طلاق، تعدّد ازدواج، متعہ وغیرہ کے متعلق میری کتاب مطالب الفرقان جلد سوم دیکھئے۔

کرسکتی ہے تو انہی پابندیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے خلاف مودودی مرحوم کا ارشاد یہ تھا کہ

کم سنی کی عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کردینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت اکتوبر ۱۹۷۶ء

بحوالہ طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۷۷ء)

کم سن بچیوں کے ساتھ خلوت! (معاذ اللہ)۔ یہ حضرات اس کی تائید میں یہ سند لایا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ میں نے بدلائل و اسناد یہ ثابت کیا کہ یہ دشمنوں کی طرف سے وضع کردہ افسانہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ (مجھ پر جو کفر کا فتویٰ لگایا گیا تھا، اس کی ایک بنیاد یہ بھی تھی کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے جس سے بخاری کی ایک روایت پر زد پڑتی ہے۔ یعنی حضورؐ رسالتمآب کی ذاتِ اقدس پر زد پڑتی ہے تو کچھ مضائقہ نہیں، بخاری کی روایت پر زد نہیں پڑنی چاہیئے۔ یا للعجب!)۔

قرآنِ کریم نے جنت کا تصور بڑا بلند اور لطیف و نظیف پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بیان تمثیلی ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک اس کی فضا بھی جنسیات سے مملو ہے۔ مودودی مرحوم اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی پانچویں جلد میں لکھتے ہیں:-

دنیا کی زندگی میں کوئی عورت جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر، آخرت میں یہ سب نیک خواتین جنت میں داخل ہوں گی تو نوجوان اور کنواری بنادی جائیں گی۔ (صہ ۲۶۸)

جنت کی حوروں کے متعلق ارشاد ہے کہ

کفار کی وہ لڑکیاں جو سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مرگئی ہوں، انہیں حوریں بنادیا جائے گا اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں رہیں گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ صہ ۲۸۷)

(نیز۔ ایشیا۔ ۱۴ ۶/ ۷۹)

یہ حوریں، بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔ بیویاں، جنتی مردوں کے ساتھ محلات میں رہیں گی لیکن جب وہ پکنک منانے کے لئے باہر جائیں گے تو ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صہ ۳۵)

یہ ہے وہ جنت جس کی جھلک دکھا کر، نوجوانوں کو "مائل بہ اسلام" کیا جاتا ہے!

یہ حضرات، نوجوانوں کی جنسی بے راہ روی کا سبب، عورتوں کی آزادی کو دیتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ اس کا بنیادی سبب وہ تعلیم ہے جو انہیں مذہب کے نام سے دی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جنسی جذبہ کا محرک خیالات سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر نوجوانوں کے خیالات میں پاکیزگی پیدا کردی جائے تو جنسی بے راہ روی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

———— (۰) ————

میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کے نوجوانوں کو جو مشرقی ادب پڑھنے کو دیا جاتا ہے، وہ جنسیات سے بھرپور ہوتا ہے، اور جو لٹریچر مغرب سے اُمنڈ کر آتا ہے، وہ بھی فحاشیات سے لبالب بھرا ہوا۔

ہمارے مکتبوں اور دارالعلوموں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس میں بھی جنسی جذبات کی برانگیختگی کا کافی سامان ہوتا ہے۔ اور

جو نوجوان ماڈرن اسلام کی طرف آتے ہیں، انہیں بھی اسی قسم کی ہیجان خیز تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد ہر شخص نالاں ہے کہ یہاں فحاشی عام ہو رہی ہے۔ اگر ان حالات میں فحاشی عام نہ ہو تو اور کیا ہو؟ پارسائی عام ہو!!

جو قوم اس قسم کی جنس آلودہ مسموم فضا میں صدیوں سے زندگی بسر کر رہی ہو، اس کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر الوتن کی تحقیقات کے نتائج غور سے سننے کے قابل ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

> اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (CAUSES) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیرالعقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ (اس کے بعد ڈاکٹر الوتن نے ان تمام توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ، تعویذ، اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے)۔ اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں، زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہِ خاک دبا دیا

لہ دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں۔ (۴۷/۱۲)

آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آ رہی اور کیا آج بھی ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی، اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی۔ اور یہی حالت اس وقت تک چلی جا رہی ہے۔

—— (۰) ——

حرفِ آخر

آخر میں، میں اپنی قوم کے نونہالوں کو براہ راست مخاطب کرنا، اور ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری فضا ان جراثیم سے بھرپور ہو چکی ہے جو جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ لیکن آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جنسی جذبات از خود کبھی نہیں اُبھرتے۔ یہ انسان کے اپنے خیالات سے اُبھرتے ہیں۔ یعنی یہ اس وقت اُبھرتے ہیں جب آپ خود انہیں ابھارنا چاہیں۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فطرت کی طرف سے انسان کو ایسی بے پناہ قوتِ ارادی عطا کی گئی ہے کہ اس کے تمام خیالات اور خواہشات اس کے تابع رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا، آپ یہ نہ دیکھئے کہ فضا کس قدر زہرآلود ہے۔ آپ اپنی قوتِ ارادی سے کام لیجئے اور اپنے خیالات کو اس فضا سے متاثر نہ ہوتے دیجئے۔ جنسی جذبہ کس طرح خیالات کے تابع رہتا ہے، اسے اس مثال کی رُو سے سمجھئے جسے اس سے پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ ایک آوارہ، بدنہاد، جنسیات میں ڈوبا ہوا نوجوان ہے جو کسی لڑکی پر بھی ہاتھ ڈالنے سے نہیں چوکتا۔ اس کی ایک ہمشیرہ ہے، نوجوان۔ بڑی خوبصورت، نا کتخدا۔ وہ دونوں تنہا ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہیں راتوں کو تنہا سوتے ہیں۔ لڑکی ہونے کی جہت سے، اس لڑکی اور ان لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں جن کے پیچھے یہ مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ لیکن وہ اس لڑکی کی طرف جو اس کی بہن ہے، کبھی نگاہِ بد سے دیکھتا تک نہیں۔ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ بچپن سے اس کے کان میں یہ آواز پڑتی چلی آئی ہے کہ بہن کے ساتھ جنسی تعلق جائز نہیں۔ بچپن سے اس کے کان میں یہ آواز پڑتی چلی آ رہی ہے اور اس نے ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکی ....

ؔ یہ بھی قرآن ہی کی آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام .... (۴۷/۱۲) وہ سامانِ زیست سے اسی طرح کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

(یعنی بہن) کے حوالہ سے جنسی جذبہ کا خیال تک اس کے دل میں نہیں اُبھرتا۔۔۔ ساری عمر نہیں اُبھرتا۔[1] یہ چیز ہمارے معاشرہ تک ہی محدود نہیں۔ یورپ کا معاشرہ جس میں جنسیات، حیوانیت سے بھی پست سطح پر پہنچ چکی ہے، وہاں بھی اس کی غیر شعوری تعلیم و تربیت کا نتیجہ ایسا ہی مرتب ہوتا ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا قصہ شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرّم رہتا تھا۔ ان کے نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ ہوا یوں کہ وہ ہنوز بچے ہی تھے کہ لڑائی کے دوران انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کینیڈا کا کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ساتھ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی ہے، اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہے۔ اتفاق سے وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی (جو اب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی اور برسوں تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گذری، اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اخبارات کو دیئے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال پادریوں نے ان کی تسلّی تشفّی کی اور وہ پھر بہن بھائی ہی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بھائی بہن، میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ حالانکہ ایران کے شہنشاہ کھلے بندوں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کی وہ بے پناہ قوت جو جنسی جذبہ پر نہایت آسانی سے، بلکہ غیر شعوری طور پر، کنٹرول کر لیتی ہے۔

یہ مثال حقیقی بہن بھائیوں کی ہے۔ قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقی بہن بھائی ہی نہیں۔ ہر لڑکے اور لڑکی کے باہمی تعلق بہن بھائیوں کے سے ہیں، اور ان میں تبدیلی صرف اس صورت میں آتی ہے جب کسی لڑکے اور لڑکی میں نکاح ہو جائے۔ (جیسا کہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی۔ جون ۱۹۸۲ء میں بھی لکھا جا چکا ہے) اس نے جب کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹/۱۰) تو اس سے مراد یہی نہیں کہ مومن مردوں کا باہمی تعلق بھائیوں کا سا ہے۔ اس سے یہ بھی مقصود ہے کہ مومن عورتوں اور مردوں کا باہمی تعلق بھی بہن بھائیوں کا سا ہے۔ (بجز ان کے جن کے ساتھ نکاح

---

[1] بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ اپنی بیٹیوں بہنوں پر بھی دست درازی کر بیٹھتے ہیں لیکن یہ غیر معمولی واقعات نفسیاتی پاگل پن کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عام انسان ایسا نہیں کرتے۔

ہو جائے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، اسلام سے پہلے عرب جاہلیہ کا معاشرہ، دیگر خرابیوں کے علاوہ، شدت سے جنس آلود بھی تھا۔ اسی فضا کے پروردہ افراد اسلام لائے تھے۔ مناسب تعلیم و تربیت سے بتدریج آہستہ آہستہ ان کے قلب و نگاہ میں تبدیلیاں پیدا کی جاتی تھیں۔ اور اس طرح انہیں قرآن کے انتہائی معیار تک پہنچایا جاتا تھا۔ قرآن کریم کے مختلف احکام و ہدایات کا انداز یہی ہے۔ جنسیات کے معاملہ میں بھی انہیں رفتہ رفتہ اس مقام تک پہنچایا گیا جہاں یہ حقیقت ان کا جزوِ ایمان بن گئی کہ (میاں بیوی کے سوا) دنیا کی ہر عورت، ان مردوں کی بہن اور ہر مرد ان (عورتوں) کا بھائی ہے۔

یہ اس ایمان کا نتیجہ تھا کہ ان میں جنسی بے راہ روی کا امکان ہی نہ رہا۔ ہم آج عرب جاہلیہ کے مقام پر ہیں اس لئے ہمارے اصلاح احوال کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے گا جو صدرِ اوّل میں اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی مناسب تعلیم و تربیت سے قلب و نگاہ کی تبدیلی۔ ایسی تبدیلی کہ ہر نوجوان لڑکے کا ایمان ہو کہ ہر لڑکی اس کی بہن ہے، اور ہر لڑکی کا ایمان کہ ہر لڑکا اس کا بھائی ہے۔ یہ ہے إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کا عملی مفہوم۔ اس کے سوا جنسی اصلاح کی کوئی صورت نہیں۔

آج تو اس ارشادِ خداوندی کا یہ مفہوم ہمارے دلوں سے محو ہو چکا ہے لیکن اس کے دھندلے سے نقوش ابھی کل تک ہمارے معاشرے میں باقی تھے ——— بعض گھرانوں میں ان کے نشانات ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ بات چونکہ پنجابی گھروں کی ہے اس لئے اسے اسی زبان میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ باہر کوئی اجنبی مرد دستک دیتا ہے تو لڑکی ——— خواہ بچی ہو خواہ جوان۔ اندر آ کر ماں سے کہتی ہے کہ "اماں! باہر اک بھائی آیا اے، پچھدا اے تیرا ابا کتھے اے"۔ یا (مثلاً) لڑکیاں بلکہ عورتیں تک آپس میں یوں باتیں کرتی ہیں کہ ہم جو وہاں گئی ہیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ "اوتھے کتنے بھائی بیٹھے ہوئے سن"۔ یعنی ہمارے معاشرہ میں اجنبی مردوں کو کہا ہی بھائی جاتا تھا۔ اس قسم کے خیالات ہمارے معاشرہ میں اب بھی عام کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ ہم حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق کرنا سیکھ جائیں۔ حیوانی زندگی میں جنسی جذبات کی تسکین بلا حدود و قیود ہوتی ہے، انسانی زندگی میں ان کی تسکین ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کی جاسکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ اگر آپ نے اس فرق کو سمجھ کر اپنے جنسی جذبات کو اپنے خیالات کے تابع کر لیا تو آپ فضا میں پھیلے ہوئے جراثیم سے قطعاً متاثر نہیں ہوں گے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے متعلق مجھ سے نہیں، ڈاکٹر انون سے پوچھئے جس نے اپنی کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے:-

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے

مواقع ایک مدت مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔ (ص ۴۳۲)

آپ نے غور فرمایا کہ اس محقق نے جنسی اصلاح کے لئے کونسے بنیادی اصول شرط قرار دیئے ہیں؟ مردوں اور عورتوں کی مساوات اور جنسی اختلاط کے کم از کم مواقع۔ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے، ان شرائط کو لاینفک قرار دیا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی مساوات کے متعلق آپ اس مقالہ میں دیکھ چکے ہیں جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی، جون ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جہاں تک جنسی اختلاط کے مواقع کا تعلق ہے، اس نے کہہ دیا کہ قرآنی حدود و قیود سے مشروط نکاح کے سوا، اس اختلاط کی ہر شکل حرام ہے۔ اس سے یہ مواقع کم از کم حد تک محدود ہو گئے۔

نظامِ ربوبیت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظام سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟ مفکرِ قرآن **پرویز صاحب** کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:

(۱) نظام سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

★ مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔ ★ ماؤزے تنگ کا فلسفۂ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔

★ ربوٰا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ ★ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب، آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے — ضخامت سوا چار سو صفحات ...... سنہری جلد

قیمت فی جلد پچاس روپے ——— (علاوہ محصول ڈاک)

★ ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, . TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۲ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP (VIP) MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بالمقابل فون ۷۶۹۰۹ ۔ ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبد اللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی ۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل انجینئرنگ ورکس۔ چوبارہ روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی۔ مکان نمبر ۳۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پورہ۔ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد۔ باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے میڈیا پیڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم الحق۔ رہائش گاہ:- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ ۱/۱/۱۲ بی بھمبر روڈ۔۔۔۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۔۔۔ ۳۱۰۷۱)
پنجکسی تحصیل کبیروالا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ۔ (فون نمبر ۲۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۴ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/۷ پیپلز کالونی ۱ (فون ۴۲۸۵۵)